دل کے پیام
آسی رام نگری

چودہ دلآویز و دلکش بلند پایہ رومان

دل کے پیام

از

جناب آسی رام نگری

پبلشر

رسالہ بیسویں صدی دہلی

قیمت دو روپیہ

تیسری بار

۱۹۴۹ء

تعارف

از شمس العلما حضرت علامہ تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور

افسانہ کیا ہے؟ زندگی کی اُن تلخ حقیقتوں کا بیان جن میں دبے ہوئے قہقہوں کے پیچھے افکار و آلام کے مہیب چہرے مسکراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن بھیانک مناظر کی تصویر کشی جن میں طوفان بدامن آنسوؤں کے آئینوں میں زندگی تڑپتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ افسانہ تفریح پرستوں کے لئے سامانِ دل بستگی بہم پہنچاتا ہے اور منزل طلب نگاہوں کیلئے مشعلِ راہ کا بھی کام دے سکتا ہے۔

"دل کے پیام" ملک کے مشہور و ممتاز افسانہ نگار حضرتِ آسی رام نگری کے چند اثر انگیز و عبرت آموز افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے۔ ان افسانوں میں حسن و شباب اور جذبات و رومان کے ساتھ ساتھ بصیرت و عبرت کا درس بھی موجود ہے۔

پختہ کار افسانہ نگار خود اگرچہ عمر کی اُس منزل سے ہمکنار ہو رہا ہے جو عشق و شباب کے حدود سے بہت آگے ہے۔ لیکن اس کے اندازِ نگارش کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوختہ سامان جوانی کے خاکستر میں عہدِ رفتۂ بہار کی رنگینیاں دہکتی ہوئی چنگاریوں کی صورت ابھی تابندہ ہیں۔

ان افسانوں میں چابک دست فنکار نے موثر انداز میں اپنے دل کے رنگین و متین پیام سُننے اور پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچانے کی کامیاب سعی کی ہے "دِل کے پیام" آتش بہ خامہ افسانہ نگار کے صرف خیالی پیغام نہیں۔ ان تمام کہانیوں میں جگہ جگہ صفحۂ قرطاس پر اُس کی حقیقی زندگی کی رنگین روداد بکھری پڑی ہے۔ مذاقِ درد و الم سے آشنا قاری انہیں پڑھ کر مصنّف کے الم پرست دل کی دھڑکنیں محسوس کرینگے۔

زیرِ نظر مجموعے میں اوریجنل کہانیاں بھی ہیں اور دُوسری زبانوں سے ترجمہ افسانے بھی، قابلِ داد یہ بات ہے کہ اپنے دل پذیر اسلوبِ نگارش سے مصنّف نے ترجمہ کہانیوں کو طبعزاد داستانوں کی صورت موثر بنا دیا ہے۔

تاجور

نذر

"دل کے پیام" میں اُن کے حضورِ محبت میں
نذر کرتا ہوں، جو میری آنکھوں سے اوجھل ہیں،
پھر بھی میرے دل کی دھڑکنیں سُنتے رہتے
ہیں!

دل گرفتہ
آسی

مُسافر کی ڈائری

۱۳ر جولائی ۱۹۴۹ء

ہر چند کہ جمالستانِ لاہور کی رنگینیاں اور رومان آفرینیاں دامن پکڑ رہی ہیں، اِس شہرِ رنگ و بو اور دیارِ حُسن و جمال کو عارضی طور پہ بھی چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے لیکن انسان حالات کا اسیر ہے۔ مَیں دیکھ رہا ہُوں کہ مجھے کچھ دنوں کے لئے وطن جانا ہی پڑے گا۔ بَیں سُنتا آ رہا ہُوں کہ جنّت میں داخل ہو کر پھر کوئی باہر نہیں نکالا جاتا لیکن حالات کی ستم ظریفی کو کیا کہوں کہ مَیں اس خُلد نگاہ و جنّت نظر ارض رنگین کو خیرباد کہنے کے لئے بستر باندھ رہا ہوں۔ کل شام کی گاڑی سے روانہ ہونے کا ارادہ ہے۔

۲۶ر جولائی ۱۹۴۹ء

انسان کو آب و دانہ یا حالات کا چکّر کہاں کہاں لئے پھرتا ہے۔ پرسوں لاہور

میں تھا کل گاڑی میں اور آج اپنے گاؤں میں ہوں۔ اُس گاؤں میں جو "شہرِ حبیب" ہے لیکن آہ محبوب سے بولنا تو دُور رہا۔ آنکھ بھر کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ سماج کی قیود کی دیواریں درمیان میں حائل ہیں عجیب حال ہے۔ قُرب بھی ہے بُعد بھی۔ پھر بھی اس دُوری و مجبوری کے باوجود ایک کیف انگیز لذت محسوس کر رہا ہوں ——
وصل نہ سہی حسرت ہی سہی۔ مَیں دیارِ دوست کو خلد جاوداں سمجھتا ہوں لیکن اس جنت میں راحتِ دل اور سکونِ خاطر کا کہیں سُراغ نہیں مل رہا ہے۔ پتہ نہیں رضوان کے فردوس کا کیا حال ہوگا ——

یہاں نخلستان میں آفتاب و ماہتاب کے طلوع و غروب کا نظارہ جنتِ نگاہ ہے پھر بھی کنارہ رادی کی چاندنی راتیں —— حُسن و عشق کی گھاتیں یاد آتی ہیں تو دِل تڑپ اُٹھتا ہے۔

اپنی آنکھوں میں "شام لاہور" کے رنگین جلوے لئے ہوئے پرسوں چار بجے میں بنارس روانہ ہوا۔ کتنے "صُبحِ بنارس" دیکھنے کے مُشتاق ہوں گے لیکن میرے دِل کا دامن "شام لاہور" کھینچ رہی تھی۔ میں تانگے میں بیٹھا ہُوا اسٹیشن کی طرف آرہا تھا لیکن آنکھیں انارکلی کی طرف لگی ہُوئی تھیں۔

سفر طویل تھا۔ اس لئے مَیں نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا۔ گاڑی میں کافی بھیڑ تھی لیکن ایک کرم فرما کی کوشش سے مجھے ایک ڈبے میں بآسانی جگہ مل گئی۔ مَیں اطمینان سے بیٹھا ہوا باہر دھکّے کھانے والے مُسافروں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ ایک عشوہ طراز دوشیزہ ہاتھ میں چھوٹا سا ہینڈ بیگ لٹکائے انجن سے گارڈ کے ڈبے تک کا فاصلہ اپنے نازک قدموں سے ناپ رہی تھی۔ سیکڑوں محوِ نظارہ

آنکھیں اُس کی گزرگاہ میں بچھی ہُوئی تھیں جنہیں روندتی ہُوئی وہ اِدھر سے اُدھر دوڑ رہی تھی۔ آخر تھک کر اپنے حسین چہرے سے پسینہ پونچھتی ہُوئی میری کھڑکی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اُف ——— وہ مہکی ہُوئی ریشمی زلفیں ——— وہ اُبھرا ہوا کیف زا سینہ!"

وہ گھبرائی ہوئی بولی ——— "گاڑی چھوٹ رہی ہے۔ ذرا جگہ دے سکتے ہیں؟" میں کیا جواب دیتا۔ "نا گھر تیرا نا گھر میرا۔ چڑیاں رَین بسیرا" والی بات تھی۔ ایک برتھ پر ایک دراز قامت صاحب بہادر ڈٹے ہوئے تھے۔ دُوسرے پر سردار جی جھپکیاں لے رہے تھے۔ تیسرے پر لالہ جی پڑے پڑے گلا صاف کر رہے تھے۔ چوتھے پر میں تنہا بیٹھا خیالات کے جھُولے میں جھُول رہا تھا۔ میں نے چونک کر کہا ——— "ہاں ہاں آیئے!"

اُس نے میرے بستر کے آخری کنارے پر بیٹھنا چاہا تو میں بولا ——— "بستر ہی پر بیٹھیئے۔ یہ کوئی تختِ طاؤس تو نہیں!"

وہ کچھ اس انداز سے مُسکرائی کہ میں کانپ اُٹھا۔ قلی سامان رکھ کر چلا گیا۔ اُس کا خادم بغل کے "سرونٹ" میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کھلی تو میں نے پُوچھا "آپ کہاں اُتریں گی؟" جواب ملا "ہوڑہ" میں نے دِل ہی دل میں کہا۔ اُف! اسے اتنی دُور جانا ہے۔ پھر تو سونا تو کیا پاؤں پھیلا کر بیٹھنا بھی دو بھر ہو گیا۔

وہ عشوہ طراز لڑکی نسوانی حسن و جمال کا دِل نواز پیکر تھی۔ گداز جسم۔ سُرخ و سپید رنگ۔ مُسکراتی آنکھیں۔ اُمنڈتی جوانی۔ مچلتا ہوا شباب ——— باریک دوپٹے کے نیچے کمر تک بل کھاتی ہوئی چوٹی۔ مخملی چپلیوں پر رکھی ہوئی گلابی ایڑیاں۔

—— مانگ میں سیندور نہ تھا۔

میں نے کتاب اُٹھائی لیکن انتہائی کوشش کے باوجود پڑھنے میں جی نہ لگا تو ایک فلمی ہفت روزہ اُٹھاکر تصویریں دیکھنے لگا۔ اس شغلِ رنگین میں بھی طبیعت نہ لگی۔ تو میں باہر کے جنت نگاہ مناظر کا جائزہ لینے لگا۔ شام ہو رہی تھی۔ ہرے بھرے کھیتوں اور میدانوں پر سُنہری چادر بچھ رہی تھی۔ چاک کی طرح گھوم کر سارے مناظر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ تار کے کھمبے میرے سامنے سے نکل جاتے۔ گاڑی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ شام کا سکوت فضا پر چھا رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ میرا دل بھی خاموش تھا۔ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی تھی۔

برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ میری ہم سفر لڑکی مُسکراتی ہوئی بولی ——
"چُپ رہنے سے میرا جی گھبراتا ہے۔ نہ بولنے کا یہ برت مجھ سے نہ رکھا جائیگا میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ چار گھنٹوں سے اپنے ہونٹ سیئے بیٹھے ہیں۔"

میں شرماکر بولا۔ "معاف کیجئے۔ میں سوچ رہا تھا ......"

وہ مُسکراکر بولی "۔ آپ ضرور غلط طریقے سے کچھ سوچ رہے تھے۔ اگر صحیح طور سے سوچتے تو اتنی دیر نہ لگتی۔ آپ کہاں اُتریں گے؟"

ایک نوجوان عورت کو اس بیباکی سے سرگرم گفتگو دیکھ کر میں گھبرا سا گیا اور بھول گیا کہ کہاں اُترنا ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالنے لگا تو وہ بولی —— "آپ تنہا سفر نہ کیا کریں۔ اپنے ساتھ ایک ترجمان رکھا کیجئے۔ میں ٹی ٹی آئی نہیں ہوں جو آپ گھبراکر ٹکٹ نکال رہے ہیں۔ میں بھی ایک مُسافر

ہی ہُوں"۔

مَیں ہزیمت خوردہ کی طرح مجحُوب ہو کر بولا "جی ...... یہ بات نہیں ہے۔ مَیں کلکتہ جا رہا ہُوں"۔

مَیں نے دیکھا۔ اس کا چہرہ یکایک کِھل کر پھر مُرجھا گیا۔ وہ ٹھنڈی سانس بمشکل روک کر بولی "تو ہم کافی دیر تک ساتھ رہیں گے"۔

اُس نے کچُھ دیر چُپ رہ کر پھر کہا "ہمیں اتنا لمبا سفر ساتھ رہ کر طے کرنا ہے۔ ہمیں ایک دُوسرے کا نام جان لینا چاہیئے۔ اچھا تو آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام "چندر موہن ہے"۔ مَیں نے سنجیدہ انداز سے کہا اور ساتھ ہی غیر شعوری طور پر میرے مُنہ سے نکل گیا ——— "آپ کا نام بھی مَیں جان سکتا ہُوں ..... ؟"

"مجھے موہنی کہتے ہیں"۔ اُس نے مُسکرا کر کہا۔

مَیں نے زیرِ لب مُسکرا کر کہا ——— "بہت پیارا نام ہے"۔

جواب میں وہ بھی مُسکرا پڑی۔

نسوانی فطرت کے تقاضے سے موہنی نے گورنرس کا بار سنبھال لیا۔ زندگی میں پہلی بار مَیں نے اپنی طرف سے بے فکر ہونے کی راحت محسوس کی۔ اُس کے بکس سے چائے، پھل مٹھائیاں، چٹنی، مربّے سبھی ہی چیزیں نکلیں۔ اُس کی شیریں مسکراہٹ نے مجھے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ کہ موہنی کی مٹھائیاں اتنی میٹھی تھیں یا اس کی مُسکراہٹ کی مٹھاس اس میں گھُل مِل گئی تھی۔ میرا رُواں رُواں

احساسِ لذّت سے شرابور ہو گیا۔ ایک کے بعد دوسری پلیٹ میٹھی مُسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے آتی اور مَیں چند لمحوں میں صاف کر دیتا۔ شاید دِل کی پیاس نے پیٹ کی اشتہا کو بھی اُکسا دیا تھا۔

ہوتے ہوتے ہم ایک دُوسرے سے بے تکلّف ہو گئے۔ سماج، سیاست اور ادب پر مبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ گاڑی چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کو ایک جھٹکے میں پیچھے چھوڑتی ہُوئی دوڑ رہی تھی۔ موہنی تہذیبِ جدید کی پرستار اور روشن خیال لڑکی تھی۔ اُس کے چچا کلکتہ کے مشہور بیرسٹر تھے۔

رات ہوتے ہی ہم نے معاہدہ کر لیا کہ رات کے پہلے حصّے میں موہنی سوئیگی اور اُس کے بعد میں۔ ایک ہی برتھ تھا جس پر ہمیں باری باری زندگی کی تمام ضرورتیں پُوری کرنی تھیں۔ کھانا، پینا، بیٹھنا، سونا، سمجھوتے کے مطابق ٹھیک دس بجے موہنی سونے لگی تو مَیں اُٹھ کر پائینتی کی طرف بیٹھنے لگا۔ وہ بولی ــــ "یہ کیا کر رہے ہیں؟ آپ وہیں بیٹھے رہیں جہاں بیٹھے تھے۔ مَیں آپ کی طرف پاؤں پھیلا کر سوؤں گی؟" مجھ میں موہنی کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہ تھی۔ مَیں اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ سو گئی۔ مَیں اُس کی مدماتی جوانی کی چھلکتی ہُوئی شراب آنکھوں سے پینے لگا۔ اُس کی لمبی لمبی پلکیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اُس نے گہری نیند میں بے سُدھ ہو کر اپنا ایک ہاتھ اُلٹ کر میری گود میں رکھ دیا۔ گلابی مخمل کی طرح نرم ہتھیلی ــــــ پتلی نازک انگلیاں ــــــ جی میں آیا کہ اُس کا ہاتھ اُٹھا کر بغل میں رکھ دوں لیکن مجھ سے اُس کی بھری ہُوئی کلائی پکڑی نہ گئی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے کروٹ بدل کر پُورا ہاتھ میری گود

میں رکھ دیا۔ اُس کی پتلی نازک اُنگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں برقی روشنی میں دمک رہی تھیں۔ سانس کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُس کا اُبھرا ہوا سینہ ہل رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے میں نے شراب پی ہو۔ میرا عضو عضو ٹوٹنے لگا۔ پلکیں بوجھل ہو گئیں۔ آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ دل میں جذبات انگڑائیاں لینے لگے۔ میں شدّتِ احساس سے پسینہ پسینہ ہو گیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ اُٹھ بیٹھی اور ایک ہلکی سی انگڑائی لے کر بولی۔ "اب آپ کی باری ہے۔ جلد سو جائیے" اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ لانبی پلکیں جھکی جا رہی تھیں۔ لیکن میری آنکھوں میں کس چیز کی جلن تھی؟ مجھے اُس کا پتہ نہ تھا۔ میں نے کہا: "ابھی تو آپ ہی کے حصّے کی نیند باقی ہے پھر سو جائیے" وہ باندازِ دل رُبائی مُسکرا کر بولی: "عورتوں کو زیادہ نہ سونا چاہیئے۔ آپ میری نیند بھی مجھ سے لے لیجئے اور میری خاطر سو جائیے۔ دیر نہ کیجئے" اور کھسک کر برتھ کے آخری کنارے پر دروازے کے پاس بیٹھ گئی تو میں نے کہا: "اب آپ سرھانے کی طرف آ جائیں۔ اس طرح تو میں نہیں سو سکتا۔"

موہنی نے سنجیدہ ہو کر کہا: "آپ نہیں جانتے مرد تو عورت کے سُہاگ کے محافظ ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں سرھانے جگہ ملتی ہے اور عورت چرنوں کی داسی ہے۔ وہ سرھانے بیٹھ کر اپنی جگہ کھونا نہیں چاہتی۔ اب آپ جھگڑا نہ کریں۔ چُپ چاپ لیٹ جائیں۔"

میں لیٹ گیا۔ نیند تکیے سے نکل کر میری آنکھوں میں بھر گئی۔ ایک بار ذرا سا جاگ کر میں نے محسوس کیا کہ میں کسی انتہائی نرم چیز پر پاؤں رکھ کر سو رہا ہوں

بات یہ تھی کہ میں نے موہنی کی گود میں اپنے پاؤں رکھ دیئے تھے۔ اُنہیں اُس نے دوپٹہ سے ڈھک لیا تھا۔ تاکہ گاڑی کے دُوسرے مسافروں کی ناپاک نگاہیں نہ پڑجائیں۔ چھپانے کے اس لذت بخش احساس نے مجھے تڑپا دیا۔ میں اُٹھ بیٹھا۔ شفق کا رنگین عکس گاڑی کے اندر آرہا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے اُڑاُڑ کر موہنی کے سیاہ بال اُس کے گورے چہرے پر بکھر پڑتے تھے۔ وہ انہیں کسلمند ہاتھوں سے ہٹاتی جاتی تھی۔ میں نے اس سُہانے وقت میں موہنی کو خواب آلوُد نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے بھی بوجھل آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ دونوں پیاسی نظریں دیر تک ایک دُوسرے سے ملی رہیں۔ گاڑی کے سارے مُسافر گہری نیند میں سو رہے تھے میں نے آہستہ سے کہا "ایک بار اور سو جاؤ۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں" وُہ زیرِ لب مُسکرا کر سو گئی تو میں اُس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتا ہوا بولا ــــــ

" بس اسی طرح سوئی رہو میں بیٹھا رہوں۔ پرماتما کریں اس ہنگام سحر کی درازی سو سال سے بھی زیادہ ہو جائے اور گاڑی اسی طرح سیکڑوں سال تک دوڑتی رہے"

میری باتیں سُن کر موہنی نے آنکھیں بند کر لیں

پنجاب میل دیوانوں کی طرح دوڑ رہی تھی۔ اُسے کیا معلوُم کہ اس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے دو بندگانِ محبت دل کی دُنیا بسانے کا عہد و پیمان کر رہے ہیں

میں نے موہنی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ــــــ "موہنی!" اُس نے نیم باز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر تکیے میں مُنہ چھپا لیا۔

چاند تاروں کی اوڑھنی اوڑھے ہوئے پھر رات آئی۔ میں نے موہنی سے

کہا۔ "آج پہلے مَیں اپنی نیند کا قرض ادا کر دُوں۔ اس کے بعد تم" ——————

موہنی نے مسکرا کر منظوری دی۔ مَیں سو گیا تو اُس نے میرے دونوں پاؤں اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیئے۔ مَیں ذرا سا سر اُٹھا کر بولا —————— "موہنی! یہ تو سراسر ظلم ہے۔ بدلہ لُوں گا تو رونا مت۔ کہے دیتا ہوں صاحب کلکتہ دُور بھی نہیں۔" اس نے گلوگیر آواز سے کہا —————— "ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اگر یہ ظلم ہے تو آج اور بھی ظلم کر لینے دو۔ انتقام تو مَیں لُوں گی۔ ابھی کلکتہ بہت دُور ہے۔ تمہیں تو ایسا رلاؤں گی کہ دُنیا کھڑی تماشا دیکھے گی۔ راہ گیر تمہارے آنسو پونچھیں گے۔"

موہنی کی باتیں سُن کر مَیں کانپ اُٹھا۔ سوچا موہنی یہ کیا کہہ گئی۔ مَیں نے کہا —————— "جی بھر کر ظلم کر لے ظالم۔ ایشور سے التجا ہے کہ تُو ساری زندگی اسی طرح ظلم کرتی رہے۔ مجھے اگر رونا بھی پڑے تو تمہاری ہی چوکھٹ پر چپکے سے آنسو گرا کر چلا جاؤں گا۔ دیکھنے والوں کو دیکھنے کا موقع بھی نہ دُوں گا۔"

موہنی نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھ کر کہا —————— "کیا مَیں ایسی کٹھور ہوں؟ ایسی بات کہتے ہوئے تمہارا دل نہیں کانپتا؟"

مَیں سو گیا تو ٹھیک بارہ بجے میری آنکھ کھُلی۔ میری طرف پُر امید نگاہوں سے دیکھتی ہوئی موہنی چُپ چاپ لیٹ گئی۔ جب مَیں نے اُس کا ہاتھ اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا تو بولی —————— "یاد رکھنا —————— "کسی بانہہ گریب کی جو دھوکے چھُو جائے۔"

مَیں نے ایک لذت خیز احساس سے بیخود ہو کر کہا —————— "یعنی ——————؟"

اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا —— یعنی یہی کہ کل کلکتہ چل کر میری کوٹھی پر چلنا۔ اب تم ایشور بھی ہمیں جُدا نہیں کر سکتے۔ مَیں چچا جی سے جو کچھ کہوں گی۔ اُس کی مخالفت نہ کرنا ......"

مَیں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا —— "موہنی! میں تمہاری پہیلی نہیں سمجھ سکا۔"

اُس نے کہا: "تمہارے بھولے پن ہی پر تو مَیں مرمٹی ہوں۔ خوب جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ اچھا ذرا دیکھوں تو میرے سینے میں سلگتی ہوئی بھٹی کی گرمی تمہارے دل میں پہنچتی ہے یا نہیں۔" اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے اپنا حسین ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لیکن مَیں مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

شدّتِ احساس سے اُس پر بے خودی سی طاری ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا —— "مَیں چچا سے جو کچھ کہوں گی۔ اُس کی مخالفت نہ کرنا۔ پھر ہم دونوں اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک ہی دھاگے میں پرو کر ہمیشہ کے لئے ایک ہی بندھن میں بندھ جائیں گے سُن رہے ہو نا؟"

مَیں بولا: "سُن رہا ہوں۔ لیکن اور جو جی میں آئے اپنے چچا سے کہنا۔ مجھے باورچی نہ بنانا۔ مَیں کھانا پکانا خاک نہیں جانتا۔ رنگے ہاتھوں پکڑی جاؤ گی۔ تم بھی سُن رہی ہو نا؟"

موہنی میری گود میں زور سے ہاتھ پٹک کر بولی —— "چُپ رہو باورچی بنا کر پھر تمہیں جیون ساتھی کیسے ......" اُس کے گلابی رُخساروں پر سُرخی دوڑ گئی۔ وہ دوپٹے سے مُنہ چھپا کر لیٹ گئی۔ مجھے پتہ نہیں کب اُس پر نیند کا جادو

چل گیا اور کب وہ سپنوں کی دُنیا میں پھولوں سے کھیلنے چلی گئی۔ گاڑی دوڑ رہی تھی۔ رات بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں موہنی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ بیٹھا اپنے دل کی گدگدی سے لذت اندوز ہونے لگا۔ کبھی کبھی جھک کر میں اُس کا چہرہ دیکھ لیتا۔ گورے مکھڑے پر بکھرے ہوئے کالے کالے بال ——— نیند کے بوجھ سے جھکی ہوئی لانبی پلکیں ——— سانس کے اُتار چڑھاؤ سے سینے کا آرزو انگیز زیر و بم۔ اُف حُسنِ خوابیدہ تھا یا فتنۂ بیدار ———!"

یکایک ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ بورڈ پر نگاہ پڑی تو موٹے خط میں "بنارس کینٹ" لکھا ہوا تھا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اُف یہ حسین لمحات ——— یہ عشرت خیز ساعتیں کتنی مختصر تھیں۔ جی تو چاہ رہا تھا اس حُسنِ خوابیدہ ——— اس فتنۂ بیدار کے ساتھ میں بھی کلکتہ چلا جاؤں لیکن فرائض کا خیال دامن کھینچ رہا تھا۔ قلیوں کی چیخ پکار سے موہنی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ اُس نے مجھے افسردہ دیکھ کر ایک ہلکی انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا ——— "اُداس کیوں ہو؟" میں نے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ——— "موہنی! مجھے معاف کرنا میں کچھ دنوں کے لئے تمہارا ساتھ چھوڑ رہا ہوں۔ مجھے بنارس اُترنا ہے۔ اپنا پتہ نوٹ کرا دو۔ میں جلد ہی کلکتہ آؤں گا۔" موہنی پر جیسے بجلی گر گئی۔ اُس کے مُنہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ایک بے سر و سامان افسانہ نویس کے پاس سامان ہی کیا ہوتا۔ میں نے جلدی سے اپنی بے سر و سامانی کو سمیٹا۔ ٹوٹا ہوا ہینڈ بیگ سنبھالا۔ پرچے بغل میں دبائے اور موہنی پر حسرت بھری نگاہ ڈالتا ہوا

گاڑی سے اتر پڑا۔ اُس نے طویل سرد سانس کھینچ کر آہستہ سے کہا ——
"پیت نہیں پردیشی کی پیت ...."

آج میں کھجوروں کی چھاؤں میں بیٹھا اپنی دو روز کی ڈائری لکھ رہا ہوں لیکن آنکھوں میں موہنی کی من موہنی صورت اور گاڑی کے خلد نگاہ مناظر پھر رہے ہیں —— اُبھرے ہوئے سینے کا زیر و بم —— مخمور آنکھیں —— دراز پلکیں —— حسنِ خوابیدہ —— فتنۂ بیدار ——!!
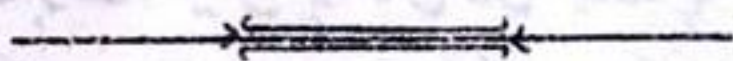
پُشپا کے خطوط

سچّی پریم کہانی
جس میں نام و مقام بھی فرضی نہیں ہیں

سُندر پُور
۳ مئی ۱۹۴۵ء

پیاری پربھا!

تمہارے اس خط کا جواب بھی دیر سے دے رہی ہوں اور آج بھی جو کچھ لکھ رہی ہوں اس پر بھروسہ نہیں کہ یہ تسلّی بخش جواب ہے یا ناآشتی بخش۔

تم نے مجھ سے گالوں کی ملاحت بڑھانے والی کسی دوا کا نسخہ پوچھا ہے میں نے اس سے پہلے تمہیں گیسو دراز کی کا پتہ بتایا تھا لیکن آج تمہاری باتوں کا جواب

دینے سے پہلے کچھ تمہیں سے پوچھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تمہیں روپ کشور کے لئے ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوئی دیکھ کر میں تمہاری پھبتیاں اڑایا کرتی تھی۔ تمہیں پاگل کہا کرتی تھی۔ تمہارے لمبی لمبی راتوں کو آنکھوں میں کاٹ دینے کو کسی خوفناک مرض سے تعبیر کرتی تھی۔ لیکن اسے میں اپنی شامت کہوں یا خوش نصیبی کہ یہی روگ مجھے آلگا۔ میں نے خود پچھلی دو راتیں تارے گن گن کر اور الٹے سیدھے گیت گنگنا کر آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ سینے میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ہے۔ دل اُچاٹ اُچاٹ اور بجھا بجھا سا ہے۔ سُنتی ہوں ہوتے ہوتے مریض ہی معالج بن جاتا ہے۔ تمہیں اس طرح کا روگ عرصے سے لگا ہے۔ دل کے سکون کے لئے کوئی تدبیر بتا سکتی ہو ــــــــ؟

تمہاری سہیلی ــــــــ پُشپا

~~~~~~~~~~(۲)~~~~~~~~~~

سُندرپور

۱۷ مئی ۱۹۴۶ء

پیاری پربھا!

تمہارا خط ملا۔ دل کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے شکریہ۔ خود ہنس ہنس کر دوسروں کو رلانا تو تمہاری پرانی عادت ہے۔ "بھینی بھینی خوشبو سے سیج بسا کر گلابی ساری اور حسبِ ضرورت فیروزی بلاؤز پہن کر کسی کا تصور کرتی ہوئی سو جاؤں۔ سینے میں ہونے والا میٹھا میٹھا درد اپنے آپ کم ہو جائے گا ــــــــ" دوسروں کو یہ نسخہ بتاتی ہو لیکن خود تڑپتی رہتی ہو ــــــــ زہر کو امرت بتانے والے
~~~~~~~~~~

دیدی جی! ہر بات میں ہنسی ٹھٹھول اچھا نہیں۔ تم کہتی ہو تمہارا خط کیسا ہے، اچھی خاصی پہیلی ہے۔ تمہیں اس کے نیچے لکھنا چاہیئے تھا "سہیلی بوجھ پہیلی!" پر بھابی میں نے تو اپنی سمجھ میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔ اگر اور تفصیل سے سننا چاہتی ہو تو لو سنو

پچھلے اتوار رکمنی کا بیاہ تھا۔ شہر سے برات آئی تھی، طرح طرح کے باجے، آتش بازیاں، سجے دھجے براتی، گاؤں میں خوب چہل پہل رہی۔ میرے گھر کے پیچھے والے کھیت میں شامیانہ تنا، ناچ گانا بھی ہوا۔ دوسرے دن بیچاری رکمنی رخصت ہو گئی۔ سسرال جاتے ہوئے اس کے دل میں آرزوؤں اور ارمانوں کی بھیڑ لگی ہو تو لگی ہو لیکن صورت اداس تھی۔ آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور کون جانے یہ آنسو خوشی کے تھے یا غم کے۔

برات رخصت ہونے کے بعد گاؤں سونا سونا ہو گیا۔ اس دن میں گھر ہی میں رہی۔ سوچتی رہی۔ ایک سہیلی بچھڑ گئی۔ جانے پھر کب ملنا ہو۔ اسی طرح ایک ایک کر کے سب بچھڑ جائیں گی۔ ان کا روگ بڑھ جانے کے ڈر سے ویدیسے مجھے ماتا پتا جی کے ہاں رہنے کو کہہ دیا ہے۔ یہاں انہیں سہیلیوں میں ہنس بول کر دن کٹ جاتے ہیں۔ جب یہ اپنی اپنی سسرال چلی جائیں گی، تو میں کیسے جیوں گی؟

دوسرے دن پورنماشی تھی۔ سورج ڈوبتے ہی آم کی باڑی سے سونے کی تھال کی طرح چاند نکلا۔ اور دیکھتے دیکھتے دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر روپہلی چادر بچھ گئی۔ میں نے سوچا۔ چلوں رکمنی سے کچھ دیر باتیں کر کے جی بہلاؤں۔ میں ہمیشہ کی طرح اس کے آنگن میں چلی گئی۔ دیکھا

ایک نوجوان تہذیب کا کرتہ پہنے بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ میں پرائے مرد کو دیکھ کر اُلٹے پاؤں لوٹنے لگی تو رجنی نے بڑھ کر میری ساری کا پلو پکڑ لیا۔ اور مسکراتی ہوئی بولی "اتنے دنوں سے جس کے سپنے دیکھ رہی تھیں۔ آج سامنا ہوا تو بھاگ کر چلیں۔ میں تمہیں بلانے کے لئے آ ہی رہی تھی۔ یہ جب جب آئے۔ تم سُسرال چلی گئی تھیں اور جب تم آئیں تو انہیں آنے کا موقع نہ مل سکا۔ یہ مجھ سے پوچھا کرتے تھے تمہاری سہیلی گوری ہیں یا سانولی؟ لمبی ہیں یا چھوٹی؟ تم پوچھا کرتی تھیں۔ تمہارے وہ ہنس مکھ ہیں یا کھٹور؟ تمہیں پیار کرتے ہیں یا نہیں؟

لو آج چاندنی رات بھی ہے ماتاجی رکمنی کے ہاں گئی ہیں۔ وہ دو گھنٹے سے پہلے تو لوٹنے کی نہیں۔ تم آپس میں دیکھ بول کر خود فیصلہ کر لو کہ کون کیسا ہے؟" یہ کہہ کر رجنی مجھے آنگن میں چھوڑ کر خود باہر جانے لگی۔ اُس کے ساتھ میں بھی بھاگی۔ اُس نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور مجھے پکڑے ہوئے آنگن میں لوٹ آئی۔

اتنی دیر میں اُس کے وہ ہاتھ مُنہ دھو چکے تھے۔ انہوں نے تولیہ سے مُنہ پونچھتے ہوئے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ میں شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ایک مدت سے انہیں دیکھنے کی آرزو تھی۔ بیاہ میں ایک جھلک دیکھی تھی لیکن وہ دیکھنا بھی کوئی دیکھنا تھا۔ اب پیاسے کے پاس جمنا ہلوریں لے رہی تھی لیکن مجھ میں اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پانی پینا پیاس بجھانا تو دور کی بات تھی۔ وہ بھی بہت شرمیلے تھے۔ پھر بھی مرد تھے۔ انہوں نے رجنی سے مسکراتے ہوئے کہا "ان کا نام جتنا پیارا ہے،

صورت اس سے بھی زیادہ پیاری ہے لیکن ایسے کٹھور کے لئے کون مرے جو سامنا ہونے پر منہ سے بولنا بھی نہ چاہے۔ ان کا نام تو پُشپا ہے اور صورت بھی پھول ہی سی ہے لیکن دل پتھر سے بھی کٹھور ہے۔"

انہوں نے یہ بات کچھ ایسے من موہنے ڈھنگ سے کہی۔ جیسے کوئی بات کہے مدیرا چھلکائے۔ میرا دل چاہا کہ کہہ دوں۔ نہیں نہیں ایسا نہ سمجھو۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ منہ سے ایک بول نہ نکل سکا۔ اتنے میں رجنی کی ماں آگئیں اور میں دیر ہونے کا بہانہ کرکے چلی آئی۔

اسے میری قسمت کی خوبی کہو یا حُسنِ اتفاق کہ سویرے ماتا جی نے اُن کے ناشتہ کا بندوبست اپنے ہاں کیا اور مجھ سے کہا۔ جب رجنی کی ماں میرے کرشن کو چاہتی ہیں تو مجھے بھی کنول کو پوچھنا چاہیئے۔ میں نے شرماتے ہوئے دبی زبان سے کہا۔" ہاں یہ تو ہونا ہی چاہیئے۔" وہ ناشتے کے وقت میرے ہاں آئے۔ ماتا جی انہیں کھلا رہی تھیں۔ میں پان بنا رہی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے انہیں دینے کے لئے ماتا جی کو پان دیا۔ وہ برتن ہاتھ میں لئے ہوئے تھیں۔ انہوں نے کہا۔" تو ہی دے دے۔ اس میں شرم کاہے کی۔ رجنی تیری بہن ہی تو ہے۔"

یہ سن کر جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا۔ ایک گدگدی سی ہوئی۔ "رجنی تیری بہن ہی تو ہے۔" ماتا جی نے کہا تھا۔ میرے دل نے اس میں اتنا اور بڑھا لیا۔" یہ اُس کے پتی ہیں تو تیرے بھی۔ ......" میں آگے نہ سوچ سکی۔ میں نے سر نیہوڑائے ہوئے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھ سے کنول کے

ہاتھ میں پان دے دیا۔ میرا مُنہ دُوسری طرف تھا۔ اُن کے پکڑنے سے پہلے ہی
مَیں نے پان چھوڑ دیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ بے اختیار ہنس دئے۔ میں نے
مُڑ کر دیکھا تو مجھے بھی ہنسی آگئی۔ مَیں نے دُوسرا پان بنا کر دیا۔ جی چاہتے ہوئے
بھی ہم ایک دُوسرے سے بول نہ سکے لیکن آنکھیں دل کا بھید نہ چھپا سکیں۔
دُوسرے دن وہ چلے گئے۔ رجنی اُداس تھی لیکن اس سے زیادہ میں
اُداس تھی ——— جی چاہ رہا تھا، وہ میری طرف ہاتھ بڑھائے رہیں
اور مَیں اُنہیں پان بنا بنا کر دیتی رہوں۔ میرے ہاتھ سے پان چھُوٹ کر زمین
پر گرتے رہیں۔ اور میرے اس بھولے پن پہ وہ بے اختیار ہنستے رہیں مجھے
بھی ہنسی آتی رہے ......

پربھا! یہ ہے میری پہیلی کی بوجھ ——— دِل کا بھید چھُپانے کی
کوشش کرتی ہوں۔ اندر ہی اندر گھُٹ کر مرتی ہوں، دل روتا ہے، ہونٹ
مسکراتے ہیں ——— آہ من ہی من میں رہ کر پریمی نینوں سے مُسکائے
......

تمہاری
پُشپا

——— (۳) ———

شنند پور
۲۸ مئی ۱۹۴۸ء

پیاری پربھا!

تمہارا خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تم میرے "حسین مرض" کے لئے مجھے

مبارک باد دے رہی ہو۔ اس کے لئے شکریہ! کنول پرسوں پھر آئے تھے۔ رجنی کی محبت اور سادہ دِلی کا حال سُن کر تم اُسے پاگل کہو گی۔ لیکن میرا دل اُس کی محبت اور عقیدت سے لبریز ہو رہا ہے۔ وہ پگلی بہت ہی فراخ دِلی سے اپنا دھن مجھے سونپ رہی ہے۔ رشک و رقابت عورت کی فطرت ہے۔ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنی محبت میں کسی کو حصّہ دار نہیں بنا سکتی لیکن رجنی کی فراخ دِلی دیکھو کہ کنول آئے تو اُس نے انہیں اُلٹے پاؤں میرے ہاں بھیج دیا اور کہا "پہلے پُشپا سے ملتے آؤ، وہ ہر دن تمہاری راہ دیکھتی ہے۔"

اس بار کنول سے آنکھیں ملتے ہی میرے دِل سے لاج جانے کہاں چلی گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم دونوں سے بہت دنوں کی ملاقات بات ہو اور ہم دونوں ہر پل ایک دُوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔ ساری باتوں کا دھیان رکھنے والی میری ماں کو بھی جانے کیا ہو گیا کہ وہ بھی ہمارے اس بڑھتے ہوئے میل جول سے ذرا بھی نہیں جھجکتیں۔ ہم اب ایک دُوسرے کے دِل کی دھڑکنوں کی آواز سُنتے ہیں اور سوچتے ہیں ہمارے پیار کی ناؤ دیکھیں کس گھاٹ لگتی ہے ——؟

رجنی ہمارا اتنا پیار دیکھ کر کہتی ہے "پگلی گھبراتی کیوں ہے۔ ہم دونوں مل کر انہیں پوجیں گی۔ کیا ایک دیوتا کی بہت سی پجارنیں نہیں ہوتیں ——؟"

میں چونک کر اس سے اس کی بات کا مطلب پُوچھتی ہوں تو چپکے سے میرے کان میں کہتی ہے "اگر تو بھی ہمارے ساتھ رہے تو کیا بُرا ہے؟ پہلے تجھے سنوا دوں گی۔

سجاؤں گی، پھر آپ پہنوں گی۔"

پگلی رجنی کی بات سُن کر مجھے ہنسی آگئی۔ ساتھ ہی دل دھڑکنے لگا۔ میں سوچنے لگی۔ کیا یہ سپنا کبھی پورا ہو سکتا ہے ——— ؟ میں تو سنتی ہوں پریم کے سپنے ہوتے نہ پورے ——— رونہ بناؤ پھر بھی ادھورے ......

اور پھر جن کے دامن سے باندھ دی گئی ہوں۔ وہ لاکھ روگی سہی۔ نکمّے اور ناکارے سہی۔ اُن کے ساتھ مجھے ہر طرح کی تکلیف اور دُکھ ہے۔ بیمار رہتے ہیں۔ کام کاج نہیں کر سکتے۔ پر میرا دھرم تو ہے کہ میں انہیں پُوجتی رہوں......

رجنی مجھے چُپ دیکھ کر میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے بولی" اری پُشپا کس سوچ میں پڑ گئی؟ میں نے جو کہا ہے۔ سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ اب تک تجھے سہیلی سمجھتی تھی۔ اب بہن بنا لوں گی۔" مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں اُس کی باہوں پر سر رکھ کر سِسکنے لگی۔ رجنی نے مجھے سینے سے لگا لیا۔

اس مرتبہ پھر کنول نے میرے ہاں ناشتہ کیا اور رات کا کھانا بھی کھایا۔ ماتا جی تو سارے دن کے کام کاج سے تھکی ہوئی تھیں۔ نو بجتے بجتے اُونگھنے لگیں اور گھر میں جا کر لیٹ رہیں۔ ہم آنگن میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پانی کے گھڑے کے پاس لگی ہوئی چنبیلی کی بیل میں تاروں کی طرح پھول کھلے ہوئے تھے۔ اُن کی مست بنا دینے والی مہک سے آنگن بس رہا تھا۔ اب ہم ایک دُوسرے سے بے تکلف اور بے باک ہو گئے تھے۔ میں نے چنبیلی کا ایک پھول توڑ کر کنول کے کوٹ میں لگا دیا۔ اُنہوں نے اپنی جیب سے اوڈو کارڈ نکال کر جواب میں میرے گال پر مَل دیا۔ میں شرما کر الگ سے ہنستی ہوئی بولی" تم بھی بڑے

وہ ہو۔ کہیں کوئی دیکھ لے تو کیا کہے گا؟"

اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب ہمارے دل صاف ہیں تو کہنے والوں کی کیا پروا۔ دُنیا نے کس کو بُرا نہیں کہا؟"

پربھا! اُس رات ہم بارہ بجے تک تاروں کی چھاؤں میں بیٹھے پیار محبّت کی باتیں کرتے رہے۔

آج کنول چلے گئے۔ مجھے ساری دُنیا سُونی سُونی سی لگ رہی ہے۔ کون جانے کب آئیں۔ ہاں! آج کل تم اپنے دِل کا بھید نہیں بتاتیں ——— کِس کے سُپنے دیکھ رہی ہو۔ کچھ تو مُنہ سے بولو ——— یہاں کل سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کالی گھٹائیں اُمنڈ رہی ہیں۔ شام سے کچھ بُوندا باندی بھی ہو رہی ہے۔ لیکن میرے من کے آنگن میں گرد اُڑ رہی ہے۔ دیکھیں۔ اس میں کب رس کی بُوند ٹپکتی ہے۔

تمہاری ——— پُشپا

——— ۴ ———

سُندر پور

۱۳ر جُون ۱۹۳۵ء

پیاری پربھا!

ادھر کئی دنوں سے میری طبیعت بُہت اداس تھی۔ جی گھبرا رہا تھا۔ ماتا جی پُوچھتیں تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں کیا بتاتی۔ کہہ دیتی طبیعت اچھی نہیں۔ لیکن سہیلیوں سے کہیں من کا بھید چُھپ سکا ہے۔ رُکمنی نے مجھے چھیڑتے ہوئے

میرا گال چھو کر کہا: "پُشپا! آج تیرے آنگن میں کاگا بول رہا ہے۔ آج تیرے چِت چور آئیں گے۔ چل ندی میں نہا آئیں۔ پہلے ہی سے بن سنور کر تیار ہو جا۔"

مَیں نے اُس سے الگ ہٹتے ہوئے کہا: "چل ہٹ۔ ہر دم کی ہنسی ٹھٹول اچھی نہیں لگتی"۔ کہنے کو تو میرے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی لیکن اس میں غم و اندوہ صاف جھلک رہا تھا۔ جسے دیکھ کر رُکمنی نے کہا: "من کا بھید چُھپانے والی آج پکڑی گئی چوری! یہ کیوں نہیں کہتی، کنول کی یاد ستا رہی ہے کنول، کنول کتنا پیارا نام ہے۔ جتنا پیارا نام ہے۔ اتنا ہی سُندر رُوپ بھی ہے۔ پُشپا میرا تو جی چاہتا ہے تیرے دھن میں، مَیں بھی حصّہ لگا لوں"۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مَیں نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا: "کون کس کا دھن رُکمنی، جس کے نصیب ہی کو آگ لگی ہو۔ وہ دھن کیا پائے گی ......

نِردھن کے دھن رام گوسائیں

رُکمنی نے مجھے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا: "پُشپا اس طرح نراش نہیں ہُوا کرتے۔ دھیرج رکھ، کبھی تو تیری آس کی پُھلواری میں بہار آئے گی"۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "کیا بہار آئے گی پگلی!

سوگ نے لُوٹ لی رُوپ جوانی چِنتا کھا گئی ماس ...... پریمی اپنی راہ سدھارا دو دن کر کے پیت ......"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میری چھوٹی بہن وِدیا نے آ کر کہا۔ "پُشپا بہن، پُشپا بہن! کنول بھیّا آئے ہیں"۔ یہ سُن کر میرا دل خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ مَیں نے خوشی سے پاگل ہو کر وِدیا کا مُنہ چُوم لیا۔ گھٹا نہ بادل، من کی نسو کھی

پھلواری برکھا سے جل تھل ہو گئی، بے سان گمان ہی کنول آ گئے۔ میں اور رکمنی رجنی کے ہاں جانے کے لئے گھر میں سے نکلی ہی تھیں کہ رجنی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اپنی شرارت بھری آنکھیں نچا کر مسکراتی ہوئی بولی " واہ پشپا دیوی یہاں ٹہلا رہی ہیں۔ رس کا لوبھی بھونرا وہاں اُداس بیٹھا ہے "

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا " چل چل آئی ہے بڑی بھیلی لاج والی بننے۔ رکمنی! ذرا دیکھنا اس کی آنکھیں، آنکھیں جن میں پریم کے سپنے جھکی جھکی شرمیلی"۔ پریم کا نام سُن کر میرا دل دھڑکنے لگا۔

رجنی کی ماں نہانے گئی تھیں۔ کنول آنگن میں بیٹھے تھے۔ میں چُپ چاپ بہا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میری بغل میں رجنی اور رکمنی بھی تھیں۔ دل میں اُمنگوں اور ارمانوں کی آندھی اُٹھ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا۔ پوچھوں مجھے بھول گئے تھے کیا؟ تمہاری یاد تو میری آنکھوں کی نیند ہی لے اُڑی ہے۔ نہیں تو سپنے ہی میں تمہیں دیکھ لیا کرتی۔ تم بھی بھول کر ادھر آنے کا نام نہیں لیتے۔

پر بہا! میں لاکھ بے تکلف اور بیباک ہو گئی تھی لیکن رکمنی اور رجنی کے سامنے میرے مُنہ سے بات نہ نکل سکی۔ ہاں آنکھوں نے دل کا بھید بتا دیا کنول نے پوچھا " کہو پشپا اچھی تو ہو۔" میں نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ میں نے سوچا۔ کنول میرے ہاں ناشتے یا رات میں کھانا کھانے کے لئے ضرور ہی آئیں گے۔ پھر جی کھول کر باتیں کروں گی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں دیکھتے دیکھتے میری اُمیدوں کے سنہرے محل گرنے لگے۔

کنول نے رجنی سے کہا " بھئی کھانا پکانے میں بہت دیر ہو گی۔ ایک پان

کھلاؤ میں چلا۔ مجھے تین بجے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ الہ آباد جانا نہایت ضروری ہے۔
خط لکھ چکا ہوں۔" میں کنول کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ انہوں
نے پان منہ میں رکھا اور میری طرف، ایک درد بھری نگاہ ڈالتے ہوئے چلنے لگے۔
اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دبی زبان سے پوچھا۔ "اب کب آؤ گے.... ؟"
انہوں نے دوسری طرف منہ کئے ہوئے کہا۔ "کوئی کیا آئے، جس کیلئے
سات سمندر پار کر کے آیا جائے اور وہ بھولے منہ بھی نہ بولے تو آنے سے فائدہ ؟"
میں بولنے ہی لگی تھی کہ رجنی نے کہا۔ "نہیں نہیں میری پشپا کے زخموں پہ
نمک نہ چھڑکو۔ میں اس کے دل کے بھید کو جھانکتی ہوں۔ یہ سوتے جاگتے
تمہارے سپنے دیکھتی ہے۔ اس کا دل بہت نازک، بہت کومل ہے۔ پشپا جو
ٹھہری، میری پشپا میری پھلواری ہے۔"
رجنی کے منانے سے روٹھے دیوتا من گئے۔ کنول نے مسکراتے ہوئے
کہا۔ "تم نے بھی میری ہنسی کو سچ سمجھ لیا۔ بھلا میں پشپا کو چھوڑ سکتا ہوں تمہاری
پشپا تمہاری پھلواری ہے، میں اس میں مہک بن کر سمایا رہوں گا۔ بھنورا بن کر
منڈلایا کروں گا۔ لاؤ پشپا ایک پان تو کھلاؤ۔ چلوں ایک ہفتہ بعد پھر آنے کی
کوشش کروں گا۔"
کنول کی باتیں سن کر سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ میرے دل کی کلی کھل گئی۔
میں نے پان بنا کر انہیں دیا۔ انہوں نے منہ میں رکھا اور مجھ پہ ایک پریم بھری نظر
ڈالتے ہوئے چلے گئے۔ رجنی دو محبت بھری نگاہوں کے اشارے دیکھتی کھڑی
رہ گئی۔

کنول کے جانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا لیکن آنکھوں
میں آنسو چھلک آئے۔ رجنی نے تسلی دیتے ہوئے کہا "پُشپا مجھ پر بھروسہ
نہیں؟ میں اپنا دھن تجھے سونپ دوں گی۔ یہ تیرے دل کو ٹھیس نہ لگنے دوں گی"
رجنی کی باتیں سُن کر میرا دل اس کی محبت اور عقیدت سے بھر گیا۔ میں سوچنے
لگی رجنی ناری ہے یا دیوی؟

اب پانچ بج رہے ہیں۔ کھانا پکانے کا وقت ہو گیا۔ گلزاری آگ لینے آئی
ہے اور میرے ہاں ابھی آگ جلی تک نہیں، ماتا جی کہہ رہی ہیں۔ اری پُشپا
آج کھانا نہیں پکانا ہے؟ چولھا اسی طرح ٹھنڈا رہے گا؟ کشن کو بھوک لگی
ہے۔ اس نے دن بھر کہاں کھایا۔ آہ پربھا! انہیں کیا پتہ کہ چولھا ٹھنڈا ہے
لیکن میرے دل میں بھٹی سلگ رہی ہے اور کون جانے میرے دل کا درد وہ
سمجھتی بھی ہوں۔ وہ بھی تو عورت ہیں۔ اچھا اب رخصت۔ باقی پھر کبھی لکھوں گی۔

تمہاری ——— پُشپا

—— (۵) ——

سُندرپور
۸ر جولائی ۱۹۴۸ء

پیاری پربھا!

محبت سے بھرا ہوا تمہارا خط ملا۔ تمہیں ساون من بھاون کی سرمستیاں
اور کیف زائیاں مبارک ہوں۔ یہاں تو میرے من میں آگ لگ رہی ہے جھولنے کو
یہاں بھی لڑکیاں گا رہی ہیں۔

گھیری آئیں سے بدریا ساون کی

ساون کی من بھاون کی

لیکن پربھا! مجھے تو یہ کالے بادل، اُمنڈتی گھٹائیں بھیانک دیو سی معلوم ہو رہی ہیں۔ مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے، کوئی ان بادلوں سے کہتا کہیں اور جاکر برسیں۔

مَیں اکیلی ہوں اور برستی رات

باوری ہو گئی ہے کیا برسات

پربھا اب مجھ سے خط نہ لکھا جائے گا۔ اِسے لو گاؤں کی پیچھے والی باڑی سے پاپی پپیہے نے "پی کہاں ——— ؟ پی کہاں ——— ؟" کی رٹ لگائی۔ آدمی تو آدمی اس پنچھی کو بھی دُکھ کے ماروں سے بیر ہوتا ہے۔ مَیں سُنتی تھی جب کسی کے بُرے دن آتے ہیں تو راہ کے روڑے بھی بَیری بن جاتے ہیں۔ سو آج آنکھوں دیکھ رہی ہوں، مَیں کہتی ہوں ———

اے پپیہا باورے پیہو پیہو جن کوک ——— !

دھیرے دھیرے سُلگت سُوں اک دم دینی پھونک

لیکن کون کسی کی سُنتا ہے پاپی اپنے دل کی لگی بجھائے جا رہا ہے میرے من کی آگ بھڑکائے جا رہا ہے ...... پربھا پریت کے روگی کے ڈھنگ بھی نرالے ہوتے ہیں جانے کیا بات پڑی اب پپیہے کی آواز نہیں آ رہی ہے تو دل کہہ رہا ہے ———

پی کی بولی بول پنچھی ——— پی کی بولی بول

پر اُس پاپی کو کیا پڑی ہے جو میرے دِل کے دُکھ کو سمجھے۔ پی کے بول سُنائے ...... اُف اب نہیں لکھا جاتا، میری بہن! میرے من کی شانتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرو ....

تمہاری ــــــ پُشپا

ــــــ (۶) ــــــ

سُندرپور

۱۵ر جولائی ۱۹۲۸ء

پربھا بہن!

تمہارا خط ملا۔ تم میری چٹھیوں کو "پریم سنگیت" کہتی ہو۔ کیوں نہ سمجھو گی انہیں گیت۔ جو لوگ سُکھی ہوتے ہیں، وہ دُکھ کے ماروں کے رونے کو گیت سمجھتے ہیں۔ پرماتما کریں تم اسی طرح سدا سُکھی رہو۔

پربھا! لوگ کہتے ہیں پریم اندھا ہوتا ہے اور پریمی پاگل! لیکن آج تمہیں اپنے پریمی کی بات سُناؤں۔ تم بھی اُس کی سمجھ پر حیران رہ جاؤ گی۔ اب کنول میرا پریمی نہیں۔ بھائی ہے اور میں اب کنول کی پُشپا بہن ہوں ــــــ!

میرے من کے مندر میں پریم کے دیپک ویسے ہی جل رہے ہیں لیکن اب میرا پریم جمنا جل کی طرح نرمل ہے۔ میری محبّت پھُول کی باس کی طرح پوِتر ہے ....

پربھا! تم کہو گی میں پہیلی بُجھا رہی ہوں۔ ہاں سچ مچ نہ جاننے والے کیلئے میری باتیں پہیلی ہی ہیں۔ لو اس کی بُوجھ بھی سُن لو ــــــ بے سان گمان ہی کنول آگئے۔ میں خوشی سے پھُولی نہ سمائی۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا رجنی ہی کے

ہاں کھایا۔ شام کا کھانا کھانے کے لئے میرے ہاں آئے۔ رکمنی کی ماں پرسوں سے بہت بیمار ہیں بچنے کی بہت کم آس ہے۔ بیچاری رکمنی روتی ہوئی آئی تھی۔ ماتا جی اُسی کے ہاں گئی تھیں۔ اور کہہ گئی تھیں کہ اُن کی طبیعت نہ سنبھلی تو میں رات میں نہ آسکوں گی۔ گھر سے ہوشیار رہنا۔ میں نے کنول کو کھانا کھلایا۔ پان دیتے ہوئے انہوں نے دھیمے سے میری اُنگلی دبائی پھر کلائی پکڑ لی۔ میں ڈر سے سہم گئی۔ کنول کو لاکھ نیک دل اور بھلا سمجھتی تھی۔ پھر بھی مرد مرد ہوتے ہیں۔ رات کا سمے اسُونا گھر۔ میں ایک انجانے ڈر سے کانپ اُٹھی۔ میں نے ہاتھ چھڑانا چاہا۔ لیکن چھڑا نہ سکی اور بے اختیار کنول کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا، میں کانپ رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی سکھ کے ساگر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے مدّتوں کا پیاسا ندی کے پاس پہنچ گیا ہو۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب کنول نے مجھے اپنے سینے سے چمٹانے اور میرے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دینے کے بدلے میری کلائی چھوڑ دی اور کہا "پُشپا! ہوش میں آؤ پاگل نہ بنو۔" میں لاج سے گڑی جا رہی تھی۔ کنول نے میری ٹھوڑی اُوپر اُٹھا کر کہا۔ "پُشپا! ایک بات کہوں بُرا تو نہ مانو گی ......؟" میرا دل پھر دھڑکنے لگا۔ جذبات میں طوفان اُٹھنے لگا۔ لیکن چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں عجیب کشمکش میں تھی۔ نہ ہنس سکتی تھی نہ رو سکتی۔ مجھے چُپ دیکھ کر کنول نے پھر کہا۔ "پُشپا! چُپ کیوں ہو؟ بولو نا۔"

میں نے دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔ "میں

اور...... تمہاری...... بات پر بُرا...... مانوں گی......؟"

کنول نے کہا۔" تم جو میرے اُوپر اتنی جان چھڑکتی ہو، ہر پل میری راہ دیکھا کرتی ہو، تم مجھ سے اس پریم کے بدلے میں کیا چاہتی ہو ——؟ مجھے کیا بنانا چاہتی ہو ——؟"

میرے پاس کنول کی بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ مَیں نے دبی زبان سے کہا" اپنے دِل سے پُوچھو...... مَیں کیا جانوں......" میری سادگی اور بھولے پن پر کنول کو ہنسی آگئی، ساتھ ہی میں بھی مُسکرا دی۔ کنول نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پھر کہا" پُشپا! بات کو پہیلی نہ بناؤ۔ تمہیں آج بتانا ہی پڑے گا کہ تم میرے اُوپر کیوں جان چھڑکتی ہو؟"

پرتبھا! سچی بات تو یہ ہے کہ جب مَیں نے کنول کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ تو اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں، میٹھی باتیں، چوڑا چکلا سینہ اور سُندر روپ دیکھ کر مَیں اس پر ریجھ گئی تھی۔ اور سوچنے لگی تھی کہ ایسا جیون ساتھی ملے تو سنسار ہی سورگ بن جائے اور یہ خیال میرے دِل میں بہت دنوں تک پلتا رہا۔ لیکن اُس دِن میرے دِل کی حالت جانے کیسی ہو رہی تھی کہ میرے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا" کنول! مَیں تمہیں بھائی سمجھ کر تم سے پریم کرتی ہوں۔ سماج نے مجھے جن کے دامن سے باندھ دیا۔ وہ بیمار ہوں یا تندرست۔ پر ایک ناری کا دھرم ہے کہ وہ اپنے پتی کو دیوتا سمجھتی رہے۔ اس لئے اب مجھے ایک دیوتا کے ہوتے دوسرے دیوتا کی چاہ نہیں۔ ہاں میرے بھائی کوئی نہیں مجھے بھائی چاہیئے، اگر تم میرے بھائی بن سکو تو بن جاؤ۔"

کنول کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولا "پُشپا! تم آج سے مجھے اپنا بھائی سمجھو اور جب کبھی تمہیں بھائی کی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کرنا۔۔۔۔۔۔" میرے مُنہ سے بھی نکل گیا۔ "کنول بھیا۔۔۔۔۔۔" لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

کنول نے کہا "پُشپا! آج تم بہت بڑی آزمائش میں پُوری اُتری ہو۔ اگر تمہارے قدم ذرا بھی ڈگمگاتے تو مَیں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کبھی تمہاری صُورت نہ دیکھوں گا۔ تمہارے گھر میں کبھی پاؤں نہ رکھوں گا۔"

میرا دل کنول کی عزّت و احترام سے بھر گیا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مَیں نے کہا "اچھا بھیّا! اب بہت رات گئی۔ جاؤ آرام کرو۔"

مَیں نے سویرے سب باتیں ماتا جی سے بتائیں۔ وہ سُن کر بہت خوش ہوئیں اور بولیں۔ "ہاں پُشپا کنول ایسا ہی ہے۔ لوگ بیٹی کو ہیٹی سمجھتے ہیں۔ لیکن تیری بدولت ہمیں ایک بیٹا بھی مل گیا۔" ماتا جی کی باتیں سُن کر میرے دِل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مَیں نے چپکے سے دل ہی دل میں کہا "کنول بھیّا!

پربھا! یہ ہے میری دُوسری پہیلی کی بوجھ! اب میں کنول کو بھیّا کہتی ہوں اور سُکھ ساگر میں ڈوب جاتی ہوں۔ تم بھی کہو گی پگلی پُشپا سدا پہیلی ہی بُجھایا کرتی ہے۔ مَیں سمجھتی ہوں سنسار سُندر سپنا ہے اور جیون ایک مدھر پہیلی ہے۔ باقی پھر لکھوں گی۔ چار بج چکے ہیں، دیر ہوگی تو ڈاک نکل جائے گی۔

تمہاری

پُشپا

(۷)

شنیدپور

یکم اگست ۱۹۴۸ء

پیاری پربھا!

تمہارا خط کئی مہروں کی چھاپ لئے ہوئے آج کی ڈاک سے پہنچا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے دُور دُور کی سیر کی ہے۔ اور ہو تم پتہ کے ساتھ ضلع لکھنا تو بھول ہی گئی تھیں۔ ہاں تم نے میرے دل کا حال پُوچھا ہے، اس میں اب بھی پریم کی جمنا بہہ رہی ہے۔ پر اب اس میں اُمنڈتی ہوئی موجیں اور مچلتی ہوئی لہریں نہیں ہیں۔ اب بھی سوتے جاگتے کنول کے سپنے دیکھتی ہوں۔ لیکن اب پہلی سی بیتابی و بیقراری نہیں۔ پرسوں پھر کنول آئے تھے۔ مجھے پہلی سی ادھیر نہ دیکھ کر پوچھنے لگے۔ "اُشپا! انجھی انجھی سی کیوں ہو؟"

مَیں نے کہا "جب ندی بھر کر اور دونوں کناروں سے مل کر بہنے لگتی ہے تو اُس کا چھلکنا بند ہو جاتا ہے، اب میرے دل میں تمہارے پریم کی چھلکتی ہوئی جمنا اتھاہ بن گئی ہے، پہلے تمہیں پانے کے لئے بے قرار تھی۔ اب پاکر مطمئن ہو گئی ہوں۔ بھیّا میرے سکُون کو بے دلی اور شانتی کو کہیں بے نیازی اور کشیدگی نہ سمجھ بیٹھنا" کنول کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے بولے۔

"نہیں اُشپا! مَیں نے یُونہی پوچھا تھا، اچھی تو ہو؟"

رجنی کو ان سب باتوں کا پتہ ہے، پھر بھی پگلی چھیڑے جاتی ہے کہتی ہے "بڑی آئی ہے کہیں کی ستی ساوتری، بھیّا والی" میں اس کی سادگی پہ

آشیں دیتی ہوں۔

اور پربھا! رجنی ہی پر کیا ہے دوسری سکھی سہیلیاں اور پاس پڑوس والے بھی ہمارے ہنسنے کھیلنے کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے۔ دنیا کیا جانے کسی کے من کے بھید کو۔ اچھا اب رخصت باقی پھر لکھوں گی۔

تمہاری ——— پشپا

(۸)

شنکر پور
۱۴ اگست ۱۹۴۸ء

پربھا بہن!

آج تمہیں خط لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں، دل بیٹھا جا رہا ہے۔ آہ! میں نے ایک کو پاکر دوسرے کو کھو دیا۔ بہن عورت کے لئے بیوگی کا سوگ سب سے بڑا دکھ ہے۔ میرا سہاگ لٹ گیا۔ تمہاری پھلواری اجڑ گئی۔ وہ جیسے بھی تھے سہارا تو تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ وہ تو جیون ساتھی تھے۔ پرماتما ان کی آتما کو شانتی دیں ...... بہن اور کیا لکھوں؟ دکھ کے ساگر میں میرے جیون کی ناؤ ہچکولے کھا رہی ہے، نہ کوئی مانجھی نہ پتوار ......

تمہاری بدنصیب بہن
پشپا

(۹)

شنند پور
۲۰ اگست ۱۹۴۸ء

پربھا بہن!

خط ملا۔ تم اتنی دور سے میرے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو دیکھ رہی ہو۔ ان سے تمہارا دل بھی بھیگ رہا ہے۔ کیوں نہ ہو، بہن کا دکھ بہن کے سوا کون سمجھے ——— بہن! جس کا سہاگ لٹ گیا، سنسار اجڑ گیا۔ اس کا حال کیا پوچھتی ہو؟ من روتا ہے، ہونٹ ہنستے ہیں، ہاں شاید تم نے نہ سنا ہو۔ پانچ دن ہوئے بیچاری رجنی کے پتاجی بھی چل بسے۔ پندرہ دن بیمار رہے۔ دوڑ دھوپ بہت ہوئی۔ پر روگ کا پتہ نہ چلا۔ اُن کی دیکھ بھال کے لئے کنول اور رجنی آئے تھے اُس کے سوا اب کون رہا۔ اب کنول یہیں رہتے ہیں کبھی دو دن کے لئے مہمان بن کر آتے تھے۔ اب یہیں بس گئے۔ یہاں گرہستی کی دیکھ بھال کی ضرورت بھی تھی اور انہیں اس گاؤں سے لگاؤ بھی تھا۔ اُن کے آجانے سے میری ڈگمگاتی ناؤ کو بھی سہارا مل گیا۔ کچھ تو ڈھارس رہے گی۔ اب شام ہوگئی۔ اندھیرا ہو چلا۔ باقی پھر لکھوں گی۔

تمہاری ——— پُشپا

~~~~~ (۱۰) ~~~~~

شنند پور
۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء

پربھا بہن!
~~~~~

آج میں بہت دنوں کے بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ اِدھر تمہاری کئی چٹھیاں آئیں۔ پر جواب نہ دے سکی۔ تم سمجھ رہی ہو، میں کسی نئی دلچسپی اور "رنگین کھیل" میں کھو کر تمہاری سُدھ بُدھ بھول بیٹھی ہوں۔ آہ بہن! جس کے نصیب ہی میں آگ لگی ہو اُس کے جیون میں رنگینی اور رس کہاں؟ پہلے پیاس نہ بجھتی تھی نہ سہی۔ ایک آدھ گھونٹ تو مل جاتا تھا۔ اب سامنے ساگر لہرا رہا ہے۔ جمنا ہلوریں لے رہی ہے تو ایک بُوند کو ترس رہی ہوں! پربھا! تم پھر کہو گی، میں پہیلی بجھا رہی ہوں۔ ہاں یہ پہیلی ہی ہے۔ جیون خود ایک اُلجھی ہوئی پہیلی ہے۔ میں تو پہیلی بُجھاتی ہوں اور آپ ہی بُوجھ بھی بتا دیتی ہوں۔ لو آج بھی سُنو

میرے اور کنول کے پریم نے جس طرح پلٹا کھایا۔ اسی طرح رجنی بھی کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اُس کا دل میری طرف سے پھر گیا ہے۔ لیکن میرے پہلو میں بھی عورت کا دل ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ وہ ایک حد تک مجبور ہے۔ رشک اور جلن ناری کا سُبھاؤ ہے۔ کبھی وہ پگلی مجھے اپنا دھن سونپتی تھی، اور کہتی تھی۔ رجنی! کیا ایک دیوتا کی کئی پجارنیں نہیں ہوتیں ——————؟ اور اب یہ حالت ہے کہ کنول پر میرا سایہ بھی نہیں پڑنے دیتی۔

پر پربھا! تم ہی سوچو، میرے لئے یہ کتنے دُکھ کی بات ہے۔ آنکھوں کے سامنے ساگر لہرائے اور میں ایک بُوند کو ترسوں؟ رجنی کتنی کٹھور ہو گئی ہے جب کنول دُور رہتے اور کبھی کبھار آتے تھے تو اور بات تھی لیکن جب سے یہاں رہنے سہنے سے ہیں اور مجھ سے زیادہ ملنے جُلنے لگے ہیں۔ رجنی کے دل میں رشک اور جلن کا جذبہ جاگ اُٹھا ہے۔ اور اس آگ کو بھڑکانے میں پاس پڑوس والوں نے

طرح طرح کی جھوٹی باتوں سے کام لیا ہے وہ اب مجھ سے ایک دم بدگمان ہو گئی ہے۔ تم کہو گی لوگوں کو کسی کے پھٹے میں پاؤں دینے سے کیا ملتا ہے؟ انہیں کچھ نہ ملے، پر دُنیا کا دستور سا ہو گیا ہے کہ وہ دو دلوں کا ملنا پھوٹی آنکھ نہیں دیکھ سکتی وہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر نہیں جھانکتی۔ خود چوری چھپے سب کچھ کرتی ہے لیکن دوسروں کی بے لوث محبّت پر اُنگلیاں اُٹھاتی ہے۔

رجنی سے میں لاکھ کہتی ہوں، بہن میں تمہارے دھن میں حصّہ دار نہیں بننا چاہتی۔ جب بھاگ ہی نے میری دُنیا اُجاڑ دی تو کوئی کیا بسا سکے گا۔ ہمارے پریم کی جس پھلواری کو تم نے اب تک اپنے پیار سے سینچا ہے۔ اسے اس طرح نہ اُجاڑو۔ ایک بھائی کا بہن سے ملنا کیا بُرا ہے۔ اگر تمہیں یہ بھی گوارا نہیں تو کنول کو اپنے ساتھ لے کر میرے گھر آیا کرو۔ ساتھ ہی لے کر چلی جایا کرو۔ لیکن بگاڑنے والوں نے رجنی کے دِل کو کچھ ایسا پھیر دیا ہے کہ وہ ہمارے دِل کا درد سمجھتی ہی نہیں۔ کنول کا اس میں کیا دوش۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، پر بیکار کی تُو تُو مَیں مَیں سے ڈرتے ہیں۔ بھلے آدمی ہیں، سوچتے ہیں عورت کے مُنہ کون لگے۔ مَیں رجنی کے اس کٹھور پن کو دیکھتی ہوں۔ اور حیران رہ جاتی ہوں۔ اُس کے پہلو میں بھی عورت کا دِل ہے۔ پھر بھی وہ ایک عورت کے درد کو نہیں سمجھتی، نہیں سمجھنا چاہتی۔

پر بھابی تمہیں سُن کر تعجب ہو گا۔ مَیں جس کنول کو بھائی سمجھتی ہوں۔ اُس کے بارے میں رجنی نے بات اُٹھا رکھی ہے کہ وہ میرا جیون ساتھی بننا چاہتا ہے، مجھ سے بیاہ کرنا چاہتا ہے یہ بات سُن کر میں لاج سے کٹ کٹ جاتی

ہوں۔ راہ چلنا، پنگھٹ پر جانا دو بھر ہو گیا ہے۔ جدھر سے نکلتی ہوں لوگ اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ جیون پاپی بے حیا ہے۔ نہیں تو کہیں ڈوب مرتی۔۔

۔۔۔۔۔ پربھا! خط بہت لمبا ہو گیا۔ اب آگے اور کیا سُننا چاہتی ہو۔ اپنی دُکھ بھری کہانی سُنا کر تمہارے دل کو بوجھل کرنے سے کیا فائدہ؟

تمہاری ــــــ پُشپا

ـــــــــ (۱۱) ـــــــــ

سُندر پور

۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۸ء

پربھا بہن!

تمہارا محبّت و ہمدردی سے بھرا ہُوا خط ملا۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تُم نے مجھے سمجھ سے کام لینے کی صلاح دی ہے۔ مَیں نے بھی اپنے دل کو بہت دبایا اور چاہا کہ محبّت کے دامن پر حرف نہ آنے دوں۔ اور رجنی کی سختیوں کو اپنی نرمی سے جیت لوں۔ لیکن کہاں تک ضبط سے کام لوں، ہم ایک دُوسرے کی صُورت دیکھنے اور بات کرنے کو ترسیں تڑپیں، اُوپر سے بدنام بھی ہوں۔ اب مجھ سے نہیں سہا جاتا۔ رجنی عورت ہے تو میرے پہلو میں بھی عورت کا دل ناری کا ہردے ہے! اگر اُسے رشک اور جلن کا جذبہ مجبور کرتا ہے۔ تو مَیں محبت سے بے بس ہوں۔ دل ہی تو ہے، محبّت کی نہیں جاتی، محبت ہو ہی جاتی ہے۔ جس طرح وہ نفرت اور عداوت کے لئے مجبور ہے میں کنول سے محبت کرنے کے لئے مجبور ہوں۔ اگر مجبوری اور بے بسی کوئی چیز ہے تو پھر

ہم دونوں برابر ہیں۔ ہاں مناسب اور نامناسب ۔ حق اور انصاف کی بات الگ ہے اور محبت اسے نہیں دیکھتی ۔ محبت اندھی ہوتی ہے نہیں تو کیسے پڑی ہے کہ سر کہھائی میں دے ۔ سینے میں بھٹی سلگاتے ۔

رتجنی کہتی ہے کنول پُشپا کے کون ہوتے ہیں جو انہیں اس سے بولنے دوں ۔ چاہے اپنے سامنے ہی سہی ۔ پُشپا مان کا پان تھی ، اتنے دنوں تک کھایا اب نہیں کھاتی ۔ پربھا اُس کی اس بات پر اب مجھے بھی ضد ہو گئی ہے ۔ جب اس طرح نہیں بولنے دیتی تو مجھے بھی کنول کی کچھ بننا ہی پڑے گا ۔ تاکہ ان سے بولنے کی حق دار ہو جاؤں ۔ سمجھنا اور برتنا تو اپنے بس کی بات ہے ۔

دُنیا نے میری یہ بات سُنی تو اُسے موقع مل گیا کہ لو اب بات کھل گئی ۔ اتنے دنوں سے سیتا ساوتری بنی بھیا کہتی تھی ۔ اب بیاہ کرنے پر تُل گئی ۔ میں یہ بات سُن کر لاج سے کٹ جاتی ہوں ، پر مجھے کسی نہ کسی طرح سے بولنے کی راہ تو نکالنی ہی ہے ۔

کتنی عورتیں مجھے احسان فراموش بھی کہتی ہیں کہ رتجنی کا دل دیکھو ، اس نے اپنا دھن پُشپا کو سونپ دیا لیکن اس کی نیت دیکھو کہ یہ امانت میں خیانت کرنے لگی ۔ پرائے دھن کو اپنانے پر تُل گئی ۔ لیکن کوئی رتجنی سے نہیں پوچھتا کہ تو نے کیوں ناگن کو چھیڑا ــــــــ ؟ کیوں سانپ کے مُنہ میں اُنگلی ڈالی ــــ ؟ جی بہلانے کے لئے دُنیا میں اور بہت سے کھلونے تھے ۔ عورت ہو کر عورت کی آبرو سے کھیلتے ہوئے تجھے ترس نہ آیا ۔ شرم نہ آئی ــــــــ ؟ دُنیا میں بڑے بڑے دانی اور دیالو ہیں ۔ لیکن تو پُشپا کو حقیر بھیک نہ دے سکی ، نہ دیتی کنول

کو کسی سے بولنے دیتی، نہ دیکھنے دیتی۔ اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی۔ منہ پر
تالا لگا دیتی ——— پر بہن کی پونجی پر ڈاکہ ڈالنا کہاں کی ریت ہے ———؟
پُشپا کنول کو بھائی کہے ——— بھائی سمجھے اور تو اُسے اس کا پتی کہتی ہے۔
غریب بیوہ عورت کی پونجی ——— اُس کا دھن ——— اُس کی لاج اور
آبرو ہی تو ہے۔ اس کے سوا اس کے پھٹے ہوئے آنچل میں اور کیا رکھا ہے
......؟ جب تو ایک ابلا کی آبرو لوٹنے پر اُتر آئی۔ تو اُسے بھی اپنے بچاؤ
کے لئے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تیرے دُکسانے پر جب پاپ کے ساگر میں ڈُبکیاں
لگانے والی سماج پرائے مرد سے بولنے پر بھی اُسے تیکھی نگاہوں سے دیکھتی
ہے تو پھر وہ اُس پرائے کو اپنائے نہ تو کیا کرے؟

لیکن پربھا! دُنیا میں انصاف کہاں؟ اس کی کمی نہ ہوتی تو سنسار سورگ
نہ بن جاتا۔ سب اُلٹا مجھی کو دوش دیتے ہیں لیکن مجھے کنول پر بھروسہ ہے
کہ انہوں نے مُنہ بولی بہن کا ہاتھ پکڑا ہے۔ تو چھوڑیں گے نہیں۔ بدنامیوں
کے بعد بھی چوری چھپے میرے ہاں آجاتے ہیں۔ مجھے تسلّی دے جاتے ہیں۔

ہاں ایک مزیدار بات سُنو۔ ایک دن کنول تھوڑا دن چڑھے میرے
ہاں آئے۔ میں نے کھیر پکائی تھی۔ میں نے کہا "بھیّا تم اچھے وقت سے آئے۔
میں کھیر پکانے چلی تو تمہاری یاد آگئی۔ بیتے ہوئے دن آنکھوں میں پھر گئے۔ جب
تم اسی آنگن میں کھانا کھایا کرتے تھے...... میں تمہارے پاس بیٹھ کر پیار
محبّت کی باتیں کیا کرتی تھی...... رجنی بہن آجاتی تھیں تو مجھے بولتی دیکھ کر
ہنس کر کہتی تھیں"۔ واہ کتنی انوکھی بات ہے۔ ابھرا چھپا ہے۔ اُچھالا ری ہے

بول رہی ہے۔ اِس وقت کوئی شاعر ہوتا تو پھڑک اُٹھتا"...... تم مُسکرا کر کہتے ——— "پُشپا خود ایک گیت ہے۔ جیسے سورگ کی اپسرائیں گاتی ہیں، دیوتا سُنتے ہیں" پھر ہم تینوں ہنس پڑتے .... آہ! وہ بیتے ہوئے دن ....

ابھی کنول نے کھیر کو ہاتھ بھی نہ لگایا تھا کہ رجنی بہن آگئیں اور لگیں زہر اُگلنے۔ کنول تو غصّے میں اُٹھ کر چلے گئے۔ لیکن ہم دونوں میں ایک جھڑپ ہو گئی۔ اُنہوں نے کہا۔ "تم انہیں اپنے ہاں کیوں آنے دیتی ہو۔؟"

مَیں نے کہا۔ "بہن! مَیں اپنے ہاں آنے والے کو کیسے بھگا دوں؟ تم روک سکو تو روک لو، میں کچھ نہ کہوں گی۔ پرائے دھن پر زور ہی کیا ہے"۔

رجنی نے طیش میں آکر کہا۔ "اچھی بات ہے، آج کے بعد مَیں انہیں تیرے گھر میں دیکھ لوں گی تو بتا دوں گی"۔

پربھا! مَیں کچھ نہ بولی۔ رجنی چلی گئیں۔ مَیں اُداس آنکھوں سے دُور نیلے آکاش میں جانے کیا دیکھتی رہ گئی۔

اب شام ہو گئی۔ ابھی دیئے کی بتّی ٹھیک کرنی ہے۔ باقی پھر کبھی لکھوں گی اب تو دل کی بات کہہ کر ہی جی کو ہلکا کر لینا رہ گیا ہے۔ کون جانے کنول آئیں نہ آئیں۔ اُن کے سامنے مصلحتیں ہیں، مجبوریاں ہیں۔

ہاں تمہارا یہ خط بہت پھڑکتا ہوا ہے۔ کیا تم نے کوئی نیا شکار پھانسا ہے؟ دیکھو کہیں خود نہ پھنس جانا ——— پریم کی راہ کٹھن ہے سجنی بھول کے مت پگ دھرنا...

تمہاری
پُشپا

(۱۲)

سُندر پور
۲۰ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء

میری پربھا!

ابھی ابھی تمہارا خط ملا۔ پوسٹ مین بُوڑھا سہی۔ لیکن جی چاہتا ہے تمہارا خط دینے والے کو ہر پل دیکھتی رہوں سُنتی ہوں پریمی کی گلی کے کتّے بھی پیارے لگتے ہیں۔ پوسٹ مین تو آدمی ہے۔ تمہارا پیام لے کر آتا ہے۔ جیسے میں جیون سندیش سمجھتی ہوں۔

پربھا! تُم میری باتیں پڑھ کر ہنستی ہوں گی۔ مَیں مُسکرا رہی ہوں، آہ کئی دن سے روتے روتے اس وقت ذرا ہنس کر جی کا بوجھ ہلکا کرنا چاہا تھا لیکن سامنے دیوار پر لگے ہُوئے آئینے میں مُنہ دیکھ رہی ہوں۔ تو گالوں پر آنسو لُڑھک آئے ہیں۔ نردھن کے دِل کی طرح آنکھوں میں اُداسی چھا رہی ہے ...... میری ٹوٹی ہوئی ناؤ کو ایک پتوار ملی تھی۔ آہ! وہ بھی ہاتھ سے چھُوٹ گئی .... من کی اُجڑی ہوئی پھلواری میں نئی کونپلیں پھُوٹ رہی تھیں۔ لیکن ایک ایسی آندھی آئی کہ اُسے جڑ سے اُکھاڑ لے گئی .... آشاؤں کے ٹمٹماتے ہُوئے دیپک کو بُجھا گئی ......

پربھا! میری بات پھر پہیلی بنتی جا رہی ہے۔ لیکن اسے پہیلی نہ بننے دُوں گی ——— تمہیں یہ سُن کر تعجب بھی ہو گا اور دُکھ بھی کہ رجنی نے اپنے ہاتھ سے لگائی ہُوئی پھلواری کو اپنے پاؤں سے روند دیا ..... اُس کے کومل پھُولوں کو

اپنے ہاتھوں سے مسل کر پھینک دیا...... اپنی سمجھ میں اپنے ہاتھ سے جلائے ہوئے پریم کے دیپک کو اپنے منہ سے بُجھا گئی......

ہاں! یہ سچ ہے کہ پھلواری اُجڑ گئی...... اس کے پھولوں کی مسلی ہوئی پنکھڑیاں ہوا میں بکھر گئیں...... لیکن یہ جھوٹ ہے کہ میرے من مندر میں جلتا ہوا پریم کا دیپک بھی بجھ گیا———!!

بیتی کنول کو لے کر گاؤں چھوڑ گئی۔ اپنا دھن سنبھال کر کہیں چلی گئی۔ اب میں ہوں اور دور دور تک پھیلے ہوئے گاؤں کے سنسان میدان...... جن پگڈنڈیوں پر میں کنول کو دیکھتی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح الھڑ کامنی سی کھجوروں کی گھنی چھاؤں میں لیٹی ہوئی ہیں...... لیکن ان پہ چلنے والا نہ رہا......

کھجوروں کے جھرمٹ میں پنگھٹ کے بڑے کنوئیں پر اب بھی گاؤں کی لڑکیوں کی بھیڑ لگتی ہے۔ لیکن اب میری سہیلیاں کنول کا نام لے کر مجھے نہیں چھیڑتیں۔ اب اُن کی نرمل ہنسی سے پنگھٹ نہیں گونجتا...... اُن سب کو بھی مجھ سے ہمدردی ہے۔ میرے دکھ سے وہ بھی اُداس ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ اُن کے پہلو میں بھی تو عورت کا دل ناری کا ہردے ہے۔ ساری دُنیا بیتی تو نہیں...

پر بھیا! کنول چلے گئے۔ لیکن میں اب بھی شام کے جھٹپٹے میں سنسان پگڈنڈی پر اُن کی راہ دیکھا کرتی ہوں...... بیدرد سماج کے بندھنوں سے بےبس ہو کر کنول نے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں میری طرف سے پھیر لیں۔ لیکن میرے من کے مندر میں اُن کے پریم کا دیپک جلتا رہے گا...... سماج کی پھونک ...... مصلحتوں کی آندھی اُسے نہیں بجھا سکتی———میں اپنے دل کی

تاریک دُنیا کو اس کی جوت سے جگمگاتی رہوں گی ...... بہن! اب نہیں لکھا جاتا۔ جیتی رہی تو پھر کبھی لکھوں گی۔

تمہاری پُشپا

(طبعزاد)

نیلی روشنائی

کسی حسینہ کی سفید دھلی ہوئی دھاری دار ساری کی طرح رُولدار کاغذوں کو رنگتے رنگتے شیام کرشن کا فاؤنٹن پن خالی ہو گیا۔ دوات پہلے ہی جواب دے چکی تھی۔ اس لئے شیام کو فاؤنٹن پن کی روشنائی لانے کے لئے چوک جانا پڑا۔

ایک دکان پر ایک لڑکی بیٹھی کاپیاں دیکھ رہی تھی۔ شیام نے صرف لڑکی کی پشت ہی دیکھی۔ موسم کی مناسبت سے اس کی ساری کا رنگ بسنتی تھا۔ پُشت پر پڑی ہوئی اس کی لمبی چوٹی کی کالی گرہیں باریک ساری کی اوٹ سے نظر آ رہی تھیں۔ شیام کا شمار اُن لوگوں میں کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا جو چوٹی تو کیا پاؤں کے ناخن ہی دیکھ کر گھونگٹ میں چھپے ہوئے حُسن کا اندازہ کر

لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے پاؤں کرسی کے نیچے مڑ کر ذرا پیچھے کی طرف نکلے ہوئے تھے۔ اس طرح سینڈل کے اوپر اٹھی ہوئی گلابی ایڑیاں دو کشمیری سیبوں کی طرح نگاہ و توجہ کا مرکز بن رہی تھیں۔

دل پھینک شیام اس حسین تیتری کو دیکھ کر اسی دکان کی طرف جھکا اور وہاں پہنچ کر اس کی بغل سے آگے کی طرف رکھی ہوئی روشنائی کی ایک شیشی اوپر سے پکڑ کر اٹھا لی۔ لیکن اس کے ہاتھ صرف ڈھکنا لگا اور شیشی بیٹھی ہوئی لڑکی کی گود میں گر پڑی اور ساری روشنائی اس کے کپڑے پر پھیل گئی۔

لڑکی چونک کر کھڑی ہو گئی۔ شیام کو تو جیسے بجلی کا دھکا سا لگا اور اس بدحواسی میں انتہائی کوشش کے باوجود صرف "ارے...." ہی کہہ سکا۔

لڑکی نے اوپر نگاہ اٹھائی اور شیام کی طرف دیکھ کر دوسرے ہی لمحہ ساری پر پڑی ہوئی روشنائی کی طرف دیکھا۔ اس نے کئی بار یہی کیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں کھلتیں، پھر ان پر لانبی پلکیں جھک جاتیں اور ساتھ ہی نیچے گالوں پر لانبی پلکوں کا سایہ پڑتا۔ بڑی بڑی موٹی آنکھوں میں بلا کا جادو ہوتا ہے لیکن لڑکی کے ابروؤں پر بل پڑے ہوئے تھے، اس لئے شیام ان سے مسحور نہ ہوا، سہم گیا۔

شیام ندامت آمیز لہجے میں دبی زبان سے بولا "میں نے گرایا نہیں...."

لڑکی نے مستفسرانہ انداز میں پھر نگاہ اوپر اٹھائی۔

"میں نے نہیں گرائی.... گر گئی...." شیام نے رکتے ہوئے کہا۔

وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں نے شرارت سے ایسا نہیں کیا۔ لیکن بدحواسی

میں اُسے مناسب الفاظ نہ ملے۔

لڑکی نے بگڑ کر کہا۔ "آپ نے نہیں گرائی! گر گئی! اس کے کیا معنی؟ بڑے کہیں کے بھولے آئے!!"

اُس نے شیام کو بیوقوف اور بدتمیز نہیں کہا۔ صرف "بھولا" کہا اور سچ پوچھیے تو مشرقی فضا میں پروان چڑھی ہوئی لڑکی کسی نوجوان کو بگڑنے کے لئے اس سے زیادہ سخت لفظ استعمال بھی کیا کر سکتی تھی؟

بوڑھا دکاندار شیام کے اس آڑے وقت میں کام آیا اور بولا: "جانے بھی دیجیے! ایک گاہک کے فاؤنٹین پن کا نب ٹیسٹ کرنے کے لئے میں نے یہ شیشی کھولی تھی۔ ڈھکنا ڈھیلا رہ گیا ہوگا۔"

"تو آپ سے پوچھ کر کیوں نہیں اُٹھایا؟" لڑکی نے دکاندار سے سوال کیا۔ لیکن اُس کی نگاہیں شیام کی طرف تھیں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ جواب شیام دے۔

شیام نے نگاہ نیچی اور ٹھوڑی اُوپر کر لی اور کرتے کے گلے میں اُنگلی ڈال کر اُسے ڈھیلا کرنے لگا۔ یہی جواب تھا جو اُس سے بن پڑا۔

اتنے میں لڑکی کا تانگے والا بھی آگیا۔ روشنائی کے دھبے دیکھ کر وہ بھی تیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ دکاندار نے پھر کہا۔ "جانے دیجیے جو ہُوا سو ہُوا۔"

لیکن لڑکی کی بھویں سیدھی نہ ہوئیں۔ روشنائی بُری طرح پھیل گئی تھی۔ اور کسی طرح چھپائی بھی نہ جا سکتی تھی۔

لڑکی نے ایک بار پھر تنی ہوئی بھوؤں سے شیام کی طرف دیکھا۔ شیام نے ندامت سے نگاہیں نیچی کر لیں اور کچھ دیر کے بعد جب نظر اوپر اُٹھائی تو دیکھا لڑکی

تانگے والے کو گالیاں دے کر دکاندار کے سامنے قیمت پھینکتی ہوئی تیزی سے جا کر تانگے میں بیٹھ چکی تھی۔

تانگہ چل پڑا۔ شیام اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اُس نے روشنائی کی دوسری شیشی لی۔ اور بے دلی سے گھر کی طرف چل دیا۔

کچھ کھویا کھویا سا شیام اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ اگرچہ اب روشنائی آگئی تھی اور اُس نے فاؤنٹین پن بھر لیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے ناتمام نقوش کو مکمل نہ کر سکا۔ جب وہ لکھنے کے لئے قلم اُٹھاتا تو اُس کے سامنے روشنائی کے بڑے بڑے دھبّے ناچنے لگتے اور اُن کے درمیان غصّہ سے بھری دو آنکھیں گھورنے لگتیں۔

شیام کو اپنی کم گوئی پر رہ رہ کر غصّہ آرہا تھا۔ وہ سوچتا "مجھے افسوس ہے، معاف کیجئے گا" کی بجائے اُس نے صرف "ارے" کیوں کہا؟ یہ بات بھی نہ تھی۔ کہ اُسے اس طرح کے فقرے بولنے کی عادت نہ ہو۔ "معاف کیجئے" تو ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے دوستوں میں سے کسی کے کُتے کو بھی اس سے ٹھیس لگ جاتی تو از راہِ اخلاق و تہذیب اظہارِ افسوس کرتا۔ پھر اتنی بڑی غلطی پر صرف "ارے" کہنا اور معمولی طور پر بھی اظہارِ افسوس نہ کرنا کتنے گنوارپن کی بات تھی۔ بھلا لڑکی نے اُسے کتنا اُجڈ سمجھا ہوگا؟ اُس وقت اس کی عقل کہاں چلی گئی تھی؟ شیام کے کانوں میں رہ رہ کر لڑکی کے یہ الفاظ گونج رہے تھے ــــــ "آپ نے نہیں گرائی! گر گئی! اس کے کیا معنی؟ بڑے کہیں کے بھولے آئے ..... " اُس کے کان شدّتِ احساس سے رہ رہ کر جلنے لگتے۔

شیام کو اس احساس سے اور بھی افسوس ہو رہا تھا کہ لڑکی سے جاتے وقت وہ معافی بھی نہ مانگ سکا۔

＊ ＊ ＊ ＊ ＊ ＊ ＊

کئی دن گزر گئے لیکن شیام کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہو سکا۔ وہ ہر وقت اس فکر میں رہتا تھا۔ کہ وہ کب ملے اور یہ کب اُس سے معافی مانگ کر اس اذیت سے نجات پائے۔ اِس عرصے میں اُس کی نظر سے سیکڑوں لڑکیاں گزریں۔ لیکن وہ نہ ملی۔ اس لئے کاشتکار کے قرض کی طرح اُس کے دل کا بوجھ اُتر نہ سکا۔

لیکن ایک روز شیام کی قسمت بیدار ہوئی اور وہ لڑکی ایک دوسری دکان پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ پیچھے ہی سے دیکھ کر اُس نے اسے پہچان لیا۔ اُس کا دِل دھڑکنے لگا۔ وہ سانس روک کر سامنے آیا۔ شیام پر نگاہ پڑتے ہی لڑکی یک بیک اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سنبھلتی سکڑتی ایک طرف ہو گئی۔

یہ دیکھ کر دکاندار حیرت سے پُوچھنے لگا "کہئے کیا بات ہے ——؟"

لڑکی نے شرارت آمیز بھولے پن سے شیام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پہلے آپ کو فاؤنٹین پین کی روشنائی دے دیجئے۔ اس کے بعد کوئی اور کام کیجئے۔"

"آج مجھے روشنائی نہیں لینی ہے ......" شیام نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اُس نے سوچا، روشنائی گر جانے کی ذرا سی بات کو افسانہ کون بنائے؟ اور گئی گذری بات کو دُہرا کر لوگوں کو ہنسنے کا موقع کیوں دے؟ معافی اور معذرت خواہی کی ضرورت ہی کیا ہے؟

شیام کی بات سُن کر لڑکی نے اطمینان کی سانس لی۔

"تو آپ کو کیا چاہیئے بابو صاحب؟" دکاندار نے پوچھا۔

شیام کا جذبۂ خودداری اور مرد ہونے کا احساس تلملا کر بیدار ہو گیا۔ وہ کسی لڑکی کے سامنے نام کے لئے بھی جھکنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اُس نے دکاندار سے کہا "ایک ساڑی چاہیئے ......"

یہ سُن کر لڑکی کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے اپنی لانبی پلکیں اُوپر اُٹھائیں۔

"کیسی ساڑی آپ کو دکھاؤں؟" دکاندار نے پوچھا۔

"زرد بسنتی رنگ کی ساڑیوں میں جو ساڑی آپ کے ہاں سب سے بیش قیمت ہو۔" لڑکی کی بھویں پھر تن گئیں لیکن جھنجھلاہٹ سے نہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش سے!

دکاندار نے ایک آدمی سے دھوتیوں کا ایک خاص گٹھا لانے کے لئے کہا۔ اسی دوران میں لڑکی کپڑوں کی قیمت دے کر جلدی سے تانگے میں جا بیٹھی۔ شیام مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ اُسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک پُر معنی مُسکراہٹ تھی۔ آج شیام کو پھر شکست ہوئی۔ اسے ایک بسنتی رنگ کی ساڑی خریدنا ہی پڑی۔ جو اس وقت اس کے لئے بیکار تھی لیکن اس بار شیام نے تانگہ والے کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ اُس دن بھی یہی آدمی تھا۔ اس نے سوچا اس سے کبھی نہ کبھی لڑکی کے مکان کا پتہ لگ ہی جائے گا۔

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

شیام کے سامنے جب کاموں کا ہجوم ہوتا تو اس واقعہ کی یاد اُسے کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ اور جب اُسے کوئی کام نہ ہوتا تو وہ اُس تانگے والے کی تلاش میں نکل جاتا۔

جس سڑک پہ بابو اُما کانت ورما بار ایٹ لا رہتے تھے، اُس پہ سے شیام شہر کی سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھانتا کئی بار گزرا تھا لیکن ورما صاحب کے نام کا سائن بورڈ صرف ایک بورڈ تھا۔ وہ تانگہ والا تو تھا نہیں کہ شیام پہچان لیتا اور ایک تانگہ والے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سائن بورڈ کی طرح گیٹ پر لٹکتا رہے۔ پھر شیام حریم مقصود کا سراغ پاتا تو کس طرح ؟

تانگے والے کو سائن بورڈ کی طرح لٹکنا پڑا، نہ سائن بورڈ کو تانگے والے کی طرح چلنا پھرنا۔ پھر بھی لڑکی کے مکان کا پتہ لگ ہی گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن تانگے والے کی تلاش میں شیام اُسی سڑک پہ جا رہا تھا کہ پیچھے سے اُس کے کانوں میں سائیکل کی گھنٹی کی تیز آواز آئی۔ جیسے اس کی بے پروائی اور بے فکری سے جھنجھلا کر بجائی گئی ہو۔ شیام گھبرا کر جیسے سوتے سے جاگ کر ایک طرف ہو گیا۔ پھر بھی اتنی دیر لگی کہ پیچھے آتی ہوئی لیڈی سائیکل کو رکنا پڑا۔ شیام نے مڑ کر دیکھا وہی خشمگیں آنکھیں تھیں۔ پیچھے کیریر پہ چند کتابیں اور کاپیاں بندھی ہوئی تھیں۔

شیام کو منہ مانگی مراد ملی۔ ساری جُرأت یکجا کر کے بولا " اوہو آپ ہیں ——— ؟ "

دو سیاہ پتلیوں پر سے لانبی پلکیں اوپر اٹھیں۔ شیام نے اُن میں بھی وہی مدالیہ انداز دیکھا۔

"آپ ہی کو...... جی...... میں...... ایں...... ایں......
تلاطش کر رہا تھا"

لڑکی کو یہ توقع نہ تھی کہ کوئی اسے اس طرح ٹوکے گا ———

"کیوں ——؟" پیڈل پر پاؤں رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جی...... کہنا یہ ہے...... کہ...... کہ میری غلطی سے آپ کی ساری
پر روشنائی گر گئی تھی نہ......" شیام نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں خوب یاد ہے تو پھر ——؟"

"ہاں، تو میں نے ایک دُوسری ساری خرید لی ہے......" لیکن
افسوس کہ اُس وقت اُس کے پاس ساری کا بنڈل نہ تھا ———

لڑکی نے پھر سوالیہ انداز سے شیام کو دیکھا۔

"وہی...... وہی آپ کو دینی ہے......"

"مجھے ضرورت نہیں" کہتی ہوئی لڑکی ورما صاحب کے بنگلے میں چلی گئی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

شیام اُلٹے پاؤں واپس گیا اور ساری لایا ——— میں گی کیسے
نہیں۔ وہ کوئی جرم تو کر نہیں رہا۔ وہ ساری دے کر ہی دم لے گا۔ کپڑے والے
کی دکان پر اُس پر آوازہ کسا گیا تھا۔ لڑکی کے کوئی بڑے بوڑھے مِل جائیں گے
تو بھی کوئی پروا نہیں، وہ سب باتیں صاف صاف کہہ دیگا...... ! اسی طرح
سوچتا ہُوا شیام چہار دیواری کے پھاٹک میں داخل ہُوا۔ اندر پہنچتے ہی مالی
ملا اور بولا "کیا ہے بابو جی؟"

"یہ بنڈل اندر پہنچا دو۔"

"کِسے دینا ہے بابو جی ؟"

"جو ابھی ابھی اسکول سے سائیکل پر آئی ہیں انہیں کو۔"

"بٹیا کو ——— ؟"

"ہاں۔"

مالی چلا گیا۔ اب شیام کی وہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی نوجوانی کی طبیعت، وہ یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھیں اس کی پیش کش کس طرح قبول کی جاتی ہے۔ شاید کوئی کچھ کہنے یا پوچھنے کے لئے باہر آئے۔

تھوڑی دیر میں مالی واپس آیا اور بولا "آئیے!"

"کیوں ——— ؟"

"آپ کو بلایا ہے۔"

"کس نے ——— ؟" شیام کا دِل دھڑکنے لگا۔

"بابو جی نے۔"

"کس لئے ؟"

مالی کیا بتاتا ؟ شیام پسینے پسینے ہو گیا۔ لیکن پھر سنبھل کر مالی کے ساتھ ہو گیا۔ اُس نے کوئی جرم تو کیا نہ تھا۔

"یہ ساری بٹیا کے لئے آپ کیوں لائے ہیں ——— ؟"

شیام کو سارا قصّہ سُنانا پڑا۔

"آپ کا نام کیا ہے ؟"

"شیام کرشن سری واستو۔"

"کس محلے میں رہتے ہیں؟"

"حضرت گنج ...." شیام نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے پتا جی کا شبھ نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی ...... بابو مول چندر"

"کہاں کام کرتے ہیں؟"

شیام حیران تھا کہ اس سے اتنے سوالات کیوں کیے جا رہے ہیں؟ پھر بھی اُس نے ہمت کر کے کہا "جی۔ ڈی بی کے پیشکار ہیں"

"اچھا......" کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور کچھ دیر تک خاموش رہے۔ شیام کا دم سا گھٹ رہا تھا۔ اُس نے پوچھا "اچھا تو اب میں جا سکتا ہوں؟۔ اجازت ہے؟" اور جواب کا انتظار کیے بغیر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سلام کر کے جان بچا کر بھاگا۔ شیام ابھی پھاٹک ہی تک پہنچا تھا کہ مالی نے "ذرا ٹھہریئے بابو جی" کہتے ہوئے آ کر پان کے دو بیڑے دیئے۔

"پان تو میں کھاتا نہیں کس نے بھیجے ہیں؟"

"بٹیا نے"

شیام نے ہونٹوں سے پان لگایا ہی تھا کہ نیلی روشنائی کی طرح بہت سا کتھا اُس کی قمیض پر ٹپک پڑا۔ از راہِ شرارت بہت سا کتھا بھر دیا گیا تھا۔ مالی نے یہ دیکھ کر کہا "چہ چہ چہ" شیام کچھ غصے کچھ جھینپ سے مڑ کر پیچھے دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ نہ دیکھ سکا کہ کھڑکی میں سے کسی کی ہنسی رو کے

نہیں رُکیتی تھی۔

ورما صاحب نے آخر پتا جی کے بارے میں اتنی باتیں کیوں پوچھیں؟ وہ اُن سے میری شکایت کریں گے کیا؟ شیام کے پاؤں آگے بڑھ رہے تھے لیکن دل پیچھے ہٹ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ اُونہہ شکایت کریں گے تو میں بھی صاف صاف کہہ دوں گا کہ اُن کی لڑکی نے طعنہ دیا۔ اور مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو پتا نے دوسری ساری خرید دی، پھر بھی ان کی لاڈو نے میری ریشمی قمیص خراب کر دی۔ کیوں......؟"

اس طرح وہ دل کو بہلا دے تو دے رہا تھا لیکن جانتا تھا، شکایت ہوئی تو اچھا نہ ہوگا۔ شیام کا خیال درست نکلا۔ دو ہی تین دن کے بعد تانگہ دروازے پہ آکھڑا ہوا اور ورما صاحب آدھمکے۔ اُن کے شکایت لے کر آنے پر شیام کو پہلے تو بہت طیش آیا لیکن کچھ سوچ کر اُس نے کہیں چلے جانا ہی بہتر سمجھا اور سوچا بعد میں پتا جی کچھ کہیں گے تو جواب دے لونگا۔ ورما صاحب کے سامنے تُو تُو میں مَیں کا ہونا اچھا نہ ہوگا۔ ورنہ میری گوشمالی کی خبر اُن کی لاڈو تک پہنچ جائے گی۔

رات کو شیام گھر واپس آیا۔ تو اُس کی بھابی نے ماں کی طرف مُنہ کر کے اور اُسے گوشۂ چشم سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "چلو اماں تمہیں ایک رسم سے تو فرصت مل گئی بہو کے لئے ساری بھیجنے کی زحمت نہ اُٹھانا پڑے گی۔ پڑھے لکھے اب لڑکے خود ہی ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ... اللہ نے تمہارا یہ فرض خود ہی ادا کر دیا ہے"

شکستِ حُسن

جمیا کی چڑھتی عمر اور نکھرتا حُسن شہر کے نوجوانوں کے دھڑکتے دِلوں میں شوق انگیز خلش پیدا کر رہا تھا۔ اُس کا اُمنڈتا شباب، مچلتی جوانی، متبسّم ہونٹ اور مُسکراتی آنکھیں حُسن و جمال کے رسیا نوجوانوں کو دعوتِ عام دے رہی تھیں۔ اُس کے حُسنِ متبسّم اور جمالِ خنداں کی ترنّم ریزیوں سے فضائیں مُسکراتیں

جمیا نسوانی حُسن کا پیکرِ جمیل تھی۔ لیکن بھولی بھالی اور معصوم نہ تھی، اُسے اپنے حُسن پہ ناز تھا۔ یہ مغرور، بیباک، اور جذباتی لڑکی اپنے والدین کی تنہا اولاد تھی۔

وارفتہ نوجوانوں کے دلوں کی بڑھتی ہُوئی دھڑکن اور دیوانگی کو اگر کوئی چیز روک سکتی تھی، تو وہ جمیا کی مغرور اور بخیدہ فطرت تھی۔ وہ سیدھی سادی باتوں میں بھی

کسی کی ذرا سی لغزش کو برداشت نہ کر سکتی تھی کسی کا اپنی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھنا تک اُسے گوارا نہ تھا۔ کِتنوں کے حلقے میں اُس واقعے کی یاد اب تک تازہ تھی جب اُس نے ڈیک جیسے آوارہ اور اوباش لڑکے کو ایک ذرا سے مذاق کے لئے شارع عام پر اُس ہنٹر سے پیٹا تھا جسے لے کر وہ گھوڑے پر روز ندی کنارے گھومنے جاتی تھی۔ اس تواضع کے بعد جب کبھی ڈیک اُس کے سامنے نادانستہ آ جاتا تو آنکھیں بچا کر چُپ چاپ نکل جاتا۔ جمیا کی اس تنبیہ نے اُسے بہت کچھ سُدھار دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے باپ کی دُکان پر بیٹھنے لگا تھا۔

وجہ جو بھی ہو لیکن اپنی تمام ہمسن لڑکیوں اور ہمجولیوں کے بیاہے جانے کے بعد بھی وہ اب تک کنواری تھی۔ کوئی نوجوان کورٹ شپ کے لئے بھی اُس کے پاس پھٹکا تک نہ تھا۔ اُس کے دائم المرض اور پنشنر باپ اور اُس کی ماں کی رائے میں اب تک اُس کی شادی ہو جانی چاہیئے تھی۔ باپ جمیا کے لئے میک آرتھر کو موزوں نوجوان سمجھتا تھا۔

ایک نمائش کے سلسلے میں کچھ ہی دنوں پہلے وہ آرتھر سے متعارف ہوئے تھے۔ وہ ایک شہرت یافتہ مصوّر تھا۔ اُسے اپنی تصویروں پر یورپ کے متعدد ممالک کی بڑی بڑی نمائشوں میں گراں قدر انعامات مل چکے تھے لیکن نام و نمود اور عزّت و شہرت کے سوا اُس کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ وہ تنہائی پسند فن کار تھا۔ وہ یا تو شہر کے ہوٹلوں میں دن گذارتا۔ یا اپنے کمرے میں برش اور رنگ کی پیالیاں لئے کینوس سے اُلجھا رہتا۔

جیمیا کی ماں کی رائے آرتھر کے بارے میں شوہر سے مختلف تھی۔ اُس کے خیال میں وہ آوارہ گرد اور جیمیا کے لئے ناموزوں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جیمیا ڈاکٹر جیمس سے بیاہی جائے۔ ڈاکٹر جیمس ہومیوپیتھی کا کامیاب معالج تھا۔ اس کی پریکٹس گرد و نواح کے دو چار قصبوں میں سب سے زیادہ تھی۔ وہ اُن خوش نصیبوں میں سے تھا جن کے ہینڈ کی جیب میں ہاتھ ڈالنے سے سونا نکلتا ہے۔ وہ خاندانی اعتبار سے بھی ممتاز و موقر تھا۔

دونوں نوجوان حسین اور تندرست و توانا تھے۔ آرتھر قدرے دراز قامت اور چھریرے بدن کا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ڈاکٹر جیمس ذرا پستہ قد، گداز جسم اور متین تھا۔ کوئی لڑکی اُن دونوں میں سے کسی سے بھی شادی کر کے اپنی خوش قسمتی پر ناز کر سکتی تھی۔

والدین کے حد سے بڑھے ہوئے اصرار اور دباؤ نے جیمیا کو شادی جیسے اہم موضوع پر سوچنے کے لئے مجبور کیا۔ تنہائی میں اُس کے والد آرتھر کی تحسین و ستائش سے اُسے متاثر کرتے۔ اور اُس کی ماں جیمس کے اوصاف و محاسن کے قصیدے سناتی۔

جیمیا اپنی سہیلیوں کو اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ سیر و تفریح کرتے دیکھ چکی تھی۔ اُن کے منہ سے شادی سے پہلے دلگرفتہ عشاق کی رنگین اور دلچسپ کہانیاں بھی سن چکی تھی۔ اُس کے دل میں کبھی گدگدی، کبھی میٹھا درد اور کبھی کبھی رشک و حسد بھی پیدا ہونے لگتا تھا۔

جدائی کی اُمنگیں اب جیمیا کو مضطرب و بے قرار رکھنے لگیں۔ اُسے اپنی زندگی

کی عدم تکمیل اور تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اب اُس کی مغرور فطرت کچھ جھک سی رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے جب کبھی اُس کی نگاہ بانہوں میں بانہیں ڈالے کسی حسین و نوجوان جوڑے پر پڑتی۔ تو اُس کے دل کے کسی گوشے میں ایک ٹیس سی ہونے لگتی، رات میں پُرسکون، کھلے آسمان پر چمکتے چاند اور مُسکراتے تارے اُس کے دل میں مایوسی کی آگ بھڑکا دیتے اور وہ سینے سے تکیے کو لگا اور بستر میں مُنہ چھپا کر بھیگی ہوئی آنکھیں لئے بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگتی۔ اُس نے سیر و تفریح کو خیرباد کہہ دی اور جو باتیں سُن کر پہلے اسے چڑ ہوتی۔ اب انہیں کے لئے تڑپنے لگی۔

یہ سُن کر آپ کو بھی حیرت ہو گی کہ جمیا کے والد کی معمولی سی علالت میں شہر کے دوسرے معالج کی موجودگی میں ڈاکٹر جمیس خاص طور پر بُلائے گئے۔ جمیا نے انہیں خود اپنے گورے اور نازک ہاتھوں سے چائے تیار کر کے پلائی، اور نوجوان ڈاکٹر نے شکر کم ہوتے ہوئے بھی زیادہ مٹھاس محسُوس کی۔ اور کھانے کے لئے بہت اصرار کرنے پر اُس نے آئندہ اتوار کو آنے کا وعدہ کیا۔ اور جمیا خود اُسے دروازے تک رُخصت کرنے آئی۔ کچھ قدم چل کر ڈاکٹر نے جب پیچھے کی طرف مُڑ کر دیکھا تو جمیا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔

جمیا کی سُنہری لٹیں ہوا میں لہرا رہی تھیں، شام کے ڈوبتے ہوئے سُورج کی زرتار کرنیں اُس کے حسین مکھڑے کو اور بھی تابناک بنا رہی تھیں۔ اُسکی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ سیب کی طرح گلابی رخسار اور بھی سُرخ ہو گئے۔ ہونٹوں پر کانپتی ہوئی مسکراہٹ بارِ حیا سے دب گئی تھی۔ ڈاکٹر زخم خوردہ دل لئے، نئی اُمنگوں اور

خوش آئند آرزوؤں کے نشاط انگیز سپنے دیکھتا ہوا گھر پہنچا۔

اتوار کی شام کو گراں قیمت و پُر تکلف لباس سے ملبوس ہو کر وقتِ مقررہ سے پہلے پہنچنے پر بھی ڈاکٹر نے جمیلا اور اُس کے والدین کو اپنا منتظر پایا۔ طویل اور ختم نہ ہونے والی باتیں ہوتی رہیں، خاص کر جمیلا کے والدین کی۔ وہ اپنے خاندان کی طویل داستان ڈاکٹر کو سُنا رہے تھے جو براہِ راست اُن کے اور اُن کے بزرگوں کے اثر و رسوخ جاہ و منصب اور دولت و ثروت سے تعلق رکھتی تھی۔ ڈاکٹر خاموشی سے سُنتا اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جمیلا کی طرف دیکھ کر مُسکرا تا بھی جاتا۔

رات کے کھانے سے پہلے جمیلا نے ندی کنارے ٹہلنے کی تجویز پیش کی اور باپ کی علالت نیز ماں کی کمزوری کے باعث اُن دونوں کو تنہا ہی جانے کیلئے مجبور ہونا پڑا ——— ندی کے کنارے پھیلی ہوئی ریت پر دونوں بیٹھ گئے۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ پاس ہی درختوں کے جھُرمٹ تھے۔ چاند اوک کے ایک تناور درخت کی موٹی شاخ پر تھوڑی ٹیکے پتیوں کے بیچ میں چھپا تک رہا تھا۔ ندی کا پانی پُر سکون اور خاموش بہہ رہا تھا۔ جیسے لبوں میں کئے ہوئے غلاموں کی طرح پگڈنڈی کے کنارے اُونچے درختوں کی لمبی قطار کھڑی تھی۔ پھیلے ہوئے نیلگوں آسمان پر جہاں تہاں ایک کے بعد ایک جھلملاتے ہوئے تارے نکل رہے تھے۔ سُنسان و خاموش رات کا یہ کیف منظر، ٹھنڈی ٹھنڈی جذبات انگیز ہوا ——— جمیلا کے جوان دل کو گدگدانے لگی کہیں کہیں کسی مچھیرے کی پتلی سی ناؤ پانی کو چیرتی آگے بڑھتی نظر آجاتی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو ڈاکٹر؟" جمیلا نے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ ٹھنڈی

ہوا کا ایک ہلکا جھونکا اُس کے دل کو چھیڑتا ہوا نکل گیا۔ سنہرے بال مُنہ پر بکھر گئے۔

"اب واپس چلیں ....." ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

جیما حیران نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ اس حسین رات اور پُرکیف ماحول کو چھوڑ کر وہ کون سی کشش ہے، جو ڈاکٹر کو واپس ہونے کے لئے مجبور کر رہی ہے؟

"کیوں؟ ایسی جلدی کیا ہے ———؟" جیما نے متعجب ہو کر بھولے بچے کی طرح پوچھا۔

"خشک ٹھنڈی ہوا میں سردی لگ جانے کا خوف رہتا ہے۔ جانتی ہو، برونکائٹس ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔"

جیما نے بہت مشکل سے اپنے اُبھرتے ہوئے غصّے کو دبایا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس سرد رات میں، راحت بخش اور پُرفضا ماحول میں بھی ڈاکٹر مریضوں کا خواب دیکھ رہا ہے ——— اُس نے رومال سے مُنہ پونچھا۔ ایک مستی بھری لطیف خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ اُسے ہلکی سی کھانسی آ گئی۔

"خشک کھانسی ...... اکیوٹ برونکائٹس ......" ڈاکٹر نے آہستہ سے جیسے اپنے آپ ہی سے کہا۔ لیکن جیما نے سُن ہی لیا۔

"اب چلیں۔" ڈاکٹر نے دُوسری بار تھکی سی آواز میں جیما کے ہاتھ کو دبا کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "آج تم بے حد حسین معلوم ہو رہی ہو۔"

"صرف آج ہی ———؟" جیما کے ہونٹوں سے دل فریب ہنسی پھوٹ پڑی۔ اُس نے ایک انگڑائی لی۔ اور آہستہ آہستہ ڈاکٹر کے ساتھ گھر کی طرف چلی۔ ٹیڑھی میڑھی تنگ پگڈنڈی نے دونوں کو قریب تر کر دیا تھا۔ درختوں کی لمبی قطار سے

کے درمیان ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ڈاکٹر خاموش تھا۔ جمیا اُس کا دل ٹٹول کر بھی کچھ تھاہ پانے سے قاصر تھی ــــــــــ نسوانی شرم و حیا اُسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر کے سامنے تو ایسی کوئی معذوری نہ تھی۔ اُس کی اِس بے معنی سرد مہری پر اُسے بے حد غصہ آ رہا تھا۔

"سنبھل کر" یکایک ڈاکٹر نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا

راستے میں ایک بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ جمیا چونک پڑی۔ اگر ڈاکٹر اُسے اپنی طرف نہ کھینچ لیتا۔ تو وہ اُس سے ٹکرا جاتی ــــــــــ اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ سمٹ کر ڈاکٹر کے جسم سے جا لگی۔ ڈاکٹر کی گرم سانسیں اُس کی روح اور بالوں کو چھو گئیں۔ اور اُس نے جمیا کے دل کی دھڑکن اپنے سینے میں جذب ہوتی ہوئی محسوس کی۔

"میں نے تمہیں چونکا دیا۔ معاف کرنا" ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جمیا سنبھل کر کچھ ہٹ گئی۔ ڈاکٹر خاموش تھا۔ جمیا کا ہاتھ اب بھی اُس کے ہاتھ میں تھا۔

"تم کانپ رہی ہو۔ سانس تیز چل رہا ہے۔ یہ کسی خوفناک بیماری کی علامت ہے۔ ذرا رُک جاؤ۔ دل کی دھڑکن کم ہو جائے گی۔"

"دل پتھر کا نہیں ہوتا ڈاکٹر! یہ دھڑکتا ہی ہے" جمیا نے ہاتھ کھینچ کر چلتے ہوئے کہا۔

"الیسڈ فاس بھتری .... دوائیں بھیج دوں گا۔ کوئی ڈر کی بات نہیں ہے۔ ذہنی پریشانیوں کے باعث ایسا ہو جایا کرتا ہے۔"

جیما کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے مشین سے چلتے ہوئے کسی پتھر کے مجسّمے کے ساتھ وہ چل رہی ہے۔ مرض کو نہ سمجھ سکنے والا ڈاکٹر اس کا معالج بن رہا ہے۔ اس کے پہلو میں دل ہے اس لئے دھڑک رہا ہے لیکن ڈاکٹر ——— ؟ اس کے پاس دل ہونے کے بارے میں جیما کو شک ہونے لگا۔

گھر آ گیا۔ جیما کے والدین نہایت اشتیاق سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ سیر ہنستے ہنستے باتیں کرتے ختم ہوا۔ جیما خاموش رہی۔ رات کافی گذر چکی تھی۔

"آپ کا مزاج کچھ ناساز سا معلوم ہوتا ہے"۔ رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر نے جیما کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی ماں سے پُوچھا۔

"ہاں کچھ دنوں سے جیما کی صحت گرتی سی نظر آ رہی ہے۔ صُورت کملا گئی ہے۔ اسے نہ جانے کون سی فکر کھائے جا رہی ہے"۔ جیما کی ماں نے افسردگی سے کہا۔

"ذہنی اذیّت ——— کیا ہر وقت سوچتی رہتی ہیں؟"

"نہیں۔ کبھی کبھی"۔

"جانتا۔ تھرڈی کی ایک خوراک میں بجھا دُوں گا۔ ساری شکایتیں دُور ہو جائیں گی"۔ ڈاکٹر نے ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تندرست و توانا حسین و مہذّب نوجوان ہے"۔ ڈاکٹر کے آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی جیما کی ماں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا جیسے اُس کا دِل ٹٹول رہی ہو۔

"ایک دم حیوان ہے"۔ غصّے سے کانپتی ہوئی جیما پاؤں مار کر۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مُڑ کر بولی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے بستر میں مُنہ چھپا

کر رہی تھی۔

اُس کی ماں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر جمیا کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اُس کے والد پائپ کا ایک لمبا کش کھینچ کر منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے دھوئیں کو دیکھنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

آرتھر حال ہی میں پیرس سے واپس آیا تھا۔ وہاں کی سالانہ نمائش میں اُس کی تصویروں پر اربابِ نظر نے تحسین و ستائش کے پھول برسائے تھے۔ اور وہ اپنی کامیابی پر بے حد مسرور نظر آتا تھا۔ ایک روز راستے میں جمیا کے والد سے اُس کی ملاقات ہو گئی۔ شہر میں آکر ان سے نہ ملنے کی شکایت کرتے ہوئے وہ اُسے گھر کھینچ لائے۔

جمیا اس وقت برآمدے میں بیٹھی ہوئی ایک ادبی ماہنامہ کا مطالعہ کر رہی تھی۔ پاؤں کی آہٹ سُن کر اُس نے منہ پر سے پرچہ ہٹایا۔ فن کار آرتھر اُس پیکرِ جمیل کو دیکھ کر اُس پر فریفتہ ہو گیا۔ شہریوں کی فیشن زدہ بنی ٹھنی نوخیز دوشیزاؤں سے مختلف جمیا میں گلاب کے کھلے ہوئے پھولوں کی سی تر و تازگی اور اچھوتا پن تھا ——— اس کی حسین و سحر کار آنکھوں میں بلا کی کشش اور نازک ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔

جمیا کے والد نے آرتھر کی خوب خاطر مدارات کی۔ اُس کی خوش مزاجی نے سارے کنبے کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اور جمیا تو اُس کی باتوں سے بیحد متاثر ہوئی۔ دریچوں میں لٹکتے ہوئے ایرانی پردوں کے درمیان سے چاند جھانکنے لگا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ بادلِ نخواستہ رخصت ہوتے ہوئے آرتھر نے جیا کی طرف دیکھ کر کہا "اگر آپ مجھے صرف دو سیٹنگ بھی دے سکیں۔ تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ اگلے ہفتہ لندن میں ایک اہم نمائش ہو رہی ہے۔ میں اس میں آپ کی ایک تصویر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ دیکھیں گی کہ تخیل اور حقیقت کے امتزاج سے کینوس پر بنتے ہوئے آپ کے اس کشش انگیز پیکر اور پیکرِ جمیل کا مقابلہ نمائش کی کوئی تصویر نہ کر سکے گی۔"

جیا کا دل وفورِ مسرت سے ناچ اٹھا۔ باپ کی طرف دیکھ کر اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "مجھے منظور ہے۔"

"شکریہ مجھے آپ سے یہی توقع تھی۔" آرتھر نے کہا "وقت بہت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کل ہی سے کام شروع کر دوں۔ آپ صبح سات بجے میرے مکان پر آجائیں میں تیار ملوں گا۔ وہیں ایک کمرے میں میرا اسٹوڈیو ہے۔ چائے وغیرہ ساتھ ہی پئیں گے۔ دیکھئے یہی سفید ریشمی گاؤن پہن کر آیئے گا۔ بالوں کو کھلا ہی رہنے دیں۔ صرف ایک گلابی فیتے سے باندھ دیجئے گا۔ خیر یہ سب وہیں ٹھیک کر لیں گے۔ میرا خیال ہے آپ ایک مصور کا حسین ماڈل بن سکتی ہیں۔ اچھا اب رخصت۔"

دوسرے دن صبح جیا نے آرتھر کو ایک ڈریسنگ گاؤن پہنے ہوئے اپنا منتظر پایا۔ اس کے ہاتھ میں رنگ کے کچھ برش تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹے سے ٹیبل پر مختلف رنگوں کی پیالیاں اور سامنے کھڑے فریم پر کینوس کا ایک بڑا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ کمرہ گراں قیمت فرنیچر سے مزین تھا۔

"آئیے۔ میں جانتا تھا کہ آپ ٹھیک وقت پر آئیں گی۔ چلئے چائے پی کر کام شروع کریں۔" آرتھر نے کہا۔

"شکریہ۔ لیکن میں چائے پی کر گھر سے نکلی تھی۔"

"تو کیا ہوا۔ تھوڑی ہی پیجئے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟"

آرتھر نے خود چائے بنائی۔ جمیا اُس کے اس پُر خلوص برتاؤ سے بے حد متاثر اور خوش ہوئی۔ آرتھر نے اُسے اپنی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعات سنائے جنہیں جمیا نے انتہائی حیرت اور دلچسپی سے سُنا۔ وہ سوچنے لگی۔ یہ کتنا اخلاص پسند، محبت پرست اور زندہ دل ہے۔ اور وہ خشک مزاج بیوقوف ڈاکٹر ——— ؟

اُسے اس موقع پر ایک پُر لطف واقعہ یاد آگیا۔

ایک شوخ و شنگ لڑکی نے اپنے عاشق سے کہا۔ میری کمر کا دائرہ تمہاری بانہوں کی لمبائی کے برابر ہے۔ تو وہ سادہ لوح نوجوان ناپنے کے لئے فیتہ تلاش کرنے لگا ——— جمیا دل ہی دل میں مُسکرا پڑی۔

"اِس پیانو اسٹول پر بیٹھنے میں آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہاں بیٹھنے سے روشنی کی کرنیں آپ کے بالوں کو چھیڑتی، گالوں کو چھُوتی داخل ہونگی۔" آرتھر نے کھڑکی سے پردوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "مجھے قدرتی روشنی ہی پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ اسٹڈیو چھوٹا ہے نا۔"

جمیا چُپ چاپ بیٹھ گئی اور چاروں طرف آویزاں حسین تصویروں کو دیکھنے لگی۔ آرتھر نے بغل سے آکر ٹھوڑی پکڑ لی۔ اُس کا مُنہ اوپر اُٹھایا۔ پھر بالوں کی لٹوں کو گالوں پر سے ہٹا کر شانوں پر بکھیر دیا۔

جمیا کا گلابی چہرہ روشنی میں اور بھی نکھر آیا۔ آرتھر کے ٹھوڑی چھوتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، جب اُسے پرائے مرد نے چھوا اس کی تخلیہ پسندی اور تنہائی نے اُسے شرم و حیا کے اُن بندھنوں میں سمیٹ کر رکھا تھا، جنہیں توڑ کر سوسائٹی کی دوسری لڑکیاں آزادی سے زندگی کی گتھیاں سلجھایا کرتی ہیں ——— یکایک اُس کی نگاہ سامنے رکھے ہوئے قدِ آدم آئینے پر پڑی۔ اور وہ شرم سے ایک دم سمٹ گئی۔

"اوہ" آرتھر نے اُس کے بائیں رخسار کے چھوٹے سے تِل کو روشنی میں لانے کے لئے اُس کی ٹھوڑی کو ذرا سا گھماتے ہوئے کہا۔

آرتھر کچھ جھک کر جمیا کے پوز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی سانس جمیا کے دل کی دھڑکن میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ اُبھرے ہوئے سینوں کا زیر و بم صاف نظر آ رہا تھا۔

فن کار آرتھر کو نوجوان لڑکی کے احساسات کا اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ کی ایسی تصویر بنانا چاہتا ہوں، جو بلحاظِ فن اپنا جواب آپ ہو، ارباب نظر اُس پر تحسین و ستائش کے پھول برسائیں۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔"

جمیا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کے گاؤن کے گلے کو آرتھر نے دونوں طرف اس طرح سرکا دیا کہ اُس کے گلابی شانوں اور گوری چھاتیوں کا کچھ حصہ جھلکنے لگا۔ بالوں کی لٹیں شانوں کو چومتی ہوئی سامنے کی طرف بکھر گئیں۔

"اب ٹھیک ہوا۔" آرتھر نے جمیا کے چہرے پر نظر جما کر انتہائی سنجیدہ انداز

سے کہا۔ وہ شرم سے کانپ گئی۔

"میری طبیعت کچھ پریشان معلوم ہوتی ہے" جمیا نے آہستہ سے کہا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

آرٹسٹ حیران نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ جمیا کی آنکھیں ایک خاص انداز سے جھک رہی تھیں۔ اُس کے جسم میں ارتعاش تھا۔ وہ اپنے جذبات سے خود کھیل رہی تھی۔ اُس کے دل میں نسوانی شرم و حیا کے پردے میں چھپا ہوا ایک حسین و عشرت آگیں احساس کروٹیں لے رہا تھا۔ اُس کی نسوانیت تیرتے ہوئے رنگین تصورات کو سمیٹ کر ایک حسین دُنیا بسانا چاہتی تھی۔ جیسے وہ سمٹ کر میرا پا شوق بن گئی ہو۔

"میں کسی اور دن تصویر کھنچواؤں گی۔ آپ معاف کریں" اُس نے کچھ اُکھڑی اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا

"بیٹھئے بھی۔ کچھ ناراض تو نہیں ہو گئیں؟ ٹھہریئے میں خود پہنچا دوں گا" جمیا کو صوفے پر بٹھا کر برش اور رنگ کی پیالیں کو دور ہٹاتے ہوئے آرٹسٹ نے کہا۔ "اجلانے میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری بے تکلفی اور سادگی کو کسی اور خیال پر محمول نہ کریں گی۔ فنکار عین تخیل کے سہارے اپنے تصور کو عمل کا حسین جامہ پہناتا ہے۔ وہ پاک اور بے لوث ہوتا ہے۔ اس میں جذبات کی تسکین کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو پریشان کر دیا۔"

"نہیں پریشانی کیوں۔ مجھے تو خوشی ہوئی" جمیا نے مسکرانے کی ناکام

کوشش کرتے ہوئے کہا

وہ اب سنبھل چکی تھی۔ اُسے اب خود تعجب ہو رہا تھا کہ چند لمحات پہلے وہ اتنی از خود رفتہ کیوں ہو گئی تھی۔ وہ ایک مسرت بخش سرور محسوس کر رہی تھی۔ اُس نے کہا "آج طبیعت کچھ اداس تھی، میں نے سوچا شاید چہرے پر وہ انداز نہ پیدا کر سکوں جو آپ کو پسند ہو......"

"انداز، اوہ، میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ انداز تو تخیل کی مدد سے بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ یہی کیا ہے، میں سوچتا تھا حسین لڑکیوں کے جذبات احساسات اور دل و دماغ بھی اُن کے جسم کی طرح حسین ہوتے...... کاش ایسا ہی ہوا کرتا......"

آرتھر نے ایک طویل سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اُس کی نگاہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر جا کر مرکوز ہو گئی۔ جمیا نے دیکھا۔ وہ ایک حسین دوشیزہ کی تصویر تھی۔

"یہ تصویر کس کی ہے ———؟" جمیا یکایک پوچھ بیٹھی۔

"ایک لڑکی کی...... کچھ دنوں پہلے پیرس میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اس کی بہت سی تصویریں کھینچیں، مختلف انداز کے کئی پوز لیئے۔ وہ انتہا ہنس مکھ اور حسین تھی۔ میں اسے بہت چاہتا ہی......"

"پیار کرتا تھا، آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا؟" جمیا کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"ہو سکتا ہے۔" آرتھر نے کہا۔ "پہلے ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے پھر وہ کسی دوسرے کو......"

"اس کے بعد ——————؟"

"کچھ نہیں۔ میں جب بھی تنہا تھا۔ اب بھی تنہا ہوں —————— وہ ایک روز نہ جانے کس کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے سُنا وہ پیرس لوٹ آئی ہے۔ اور اُس نے شادی کر لی ہے۔ خیر، انقلاب و تغیر دُنیا کا اٹل قانون ہے۔ وہ خوش و خرّم اور شاد و مسرور ہے۔ یہی میرے لئے مُوجب مسرّت و طمانیت ہے۔ ہاں اگر افسوس ہے تو صرف اتنا کہ مَیں محبّت کا صلہ نہ پا سکا۔ میرے دِل میں مچلتی ہُوئی اُمنگوں کو کچل کر اُس نے مجھے جذبات پرست عاشق سے فنکار بنا دیا۔ اب مَیں صرف ظاہری حُسن کا پرستار ہوں۔ میری نظر میں ایک خوبصورت عورت اور پتھر کی حسین مُورتی دونوں برابر ہیں۔ حُسن دونوں میں جلوہ ریز ہے، عورت کا رُوپ فانی، ہنگامی اور تغیر آشنا ہے۔ اور پتھر کی مُورتی کا حُسن نسبتاً مستقل، غیر فانی و جاودانی ہے۔"

"تو آپ کسی پتھر کی مورتی سے شادی کریں گے؟" جیما نے ہونٹوں پہ کھیلتی ہوئی ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شادی ایک اصُولی بندھن اور سماجی ضابطہ ہے اور مَیں آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مَیں شادی کا قائل ہی نہیں۔ قفس میں اسیر طائر کی طرح سماج ہمیں سبز باغ دکھا کر اُلجھنوں میں جکڑ دیتی ہے۔ جن سے رہائی معلوم، مَیں کچھ عرصے کیلئے کسی سے محبّت کا رشتہ جوڑ لینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا لیکن شادی کر کے تاحیات مقید رہنا اور زندگی کا گلا گھونٹ دینا مجھے پسند نہیں۔"

جیما دل ہی دل میں تلملا اُٹھی —————— عورت اور پتھر کی مُورتی کو برابر سمجھتا

ہے ——— اور فن کار بنا ہے ——— اس کے نزدیک شادی کرنا زندگی کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ پھر بھی اسے انسان ہونے کا دعویٰ ہے ——— بیوقوف خود پتھر کا بے حس و بے جان پنجر ہے......"

"اچھا تو مَیں اب چلی" یکایک اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریئے۔ مَیں پہنچا دوں"

"آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ مَیں چلی جاؤں گی"

"آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"مَیں ناراض ہونے والی ہوتی ہی کون ہوں؟" بیبیا نے غصّے سے نچلے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر کہا، اور اسٹڈیو سے باہر نکل گئی۔ اُس کی آنکھیں پُرنم تھیں۔

ہوّا

سینما ہال میں ایک ساتھ تین چار لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ دوسری جگہ سیٹیں خالی نہ تھیں اس لئے سب کی سب نریندر کی بغل والی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھنے کے لئے نریندر کو پاؤں سمیٹنے پڑے۔ لڑکیوں کی موجودگی کے خیال سے ذرا محتاط بھی ہو گیا اور کچھ سمٹ کر اپنی کرسی میں بھلے آدمی کی طرح بیٹھ گیا۔

لڑکیوں کے ساتھ ایک ہی مرد تھا۔ جو کنارے پر بیٹھا تھا۔ اُس کی پوشش اور انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ آزاد خیال اور تہذیب جدید کا حامی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کو سنیما دکھانے لایا تھا۔ اُس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ نریندر ہی

کا ہم عمر معلوم ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کے رنگ روپ کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ہال میں کافی اندھیرا تھا۔ اوپر درمیان میں ایک ہی بتی تھی جو گہرے دودھیا رنگ کے شیشے کے گلوب میں سے مدھم سی روشنی دے رہی تھی۔ دوسری گھنٹی ہو چکی تھی۔

اندھیرا تھا، پھر بھی لڑکیوں کے حسین ملبوس سے اٹھتی ہوئی مختلف سینٹ کی مست کن خوشبو اُن کی نفاست پسندی کا پتہ دے رہی تھی اور نہ دیکھنے کے باوجود اُن کے بارے میں بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ ہاں یہ کہنا مشکل تھا کہ اُن میں سب سے زیادہ حسین کون لڑکی ہے ——؟

تیسری گھنٹی ہوئی، ہال میں سکوت چھا گیا۔ آنے والی فلموں کے نمونے اور اشتہارات دکھانے کے بعد اصل تصویر شروع ہوئی۔ ہیرو اور ہیروئن پردے پر اجنبی سے تھے۔ پہلی اتفاقیہ ملاقات تھی، آگے چل کر حالات یا اتفاقات سے مجبور ہو کر دونوں کو باتیں کرنی پڑیں۔

ہیروئن ہیرو کی شخصیت سے ناواقف تھی، اس لئے اُس سے عامیانہ لب و لہجہ میں گفتگو کرنے لگی، جس سے اُس کی کم تو ہین بھی ہوتی تھی لیکن ہیرو نے سب نظر انداز کر دیا اور نہایت شرافت سے مسکراتا ہوا باتیں کرتا رہا۔

مکالمے بہت پُر لطف تھے، تماشائیوں کی ہنسی سے ہال گونج اُٹھتا۔ ایک موقع پر ہیرو نے ہیروئن کو ایسا برجستہ اور بے ساختہ جواب دیا کہ مغرور ہیروئن مجوبہ ہو کر رہ گئی۔

فرینڈ مکالمے سے بے حد متاثر اور محظوظ ہوا اور افسانے کی ڈرامائی فضا

میں ایسا کھویا کہ اپنی بغل میں بیٹھی ہوئی لڑکی کے کندھے پر ہاتھ مار کر اپنی سیٹ پر بے اختیار اُچھل پڑا لیکن معاً اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے سوچا۔ ارے میں نے یہ کیا کیا ——— ؟

لڑکی چونک پڑی، اُس کے ہونٹوں پر تصویر کے مناظر اور مکالموں سے جو ہنسی پیدا ہوئی تھی۔ اُس پر اوس پڑ گئی۔ جھٹکے کے ساتھ مُڑ کر اُس نے نریندر کی طرف دیکھا۔

لڑکی حیران تھی، خود نریندر بھی کچھ کم حیرت زدہ نہ تھا۔ جتنا تعجب لڑکی کو اُس کی حرکت پر ہوا، اتنی ہی حیرت خود نریندر کو بھی ہوئی۔ شرم و ندامت اور خوف و ہراس سے اُس کا خون خشک ہو گیا۔

"یہ کیا ——— ؟" لڑکی نے دُرشت آواز میں سوال کیا۔ "اِس حرکت سے آپ کا مقصد ——— ؟"

"جی؟ ...... جی نہ ...... نہیں" نریندر نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ "میر...... میرا...... مقصد...... ایں ایں ...... کو...... کچھ نہ تھا......"

"کچھ نہ تھا ——— ؟" لڑکی نے دُہرا کر غصّے سے پُوچھا۔ "تو پھر کیوں ایسی حرکت کی ——— ؟"

"غ غ ...... غلطی ہو گئی۔" نریندر کا ہکلانا بند نہ ہوا۔

"میں سب سمجھتی ہوں ———" لڑکی نے ناگن کی طرح بل کھا کر کہا "تم بدمعاش ہو۔"

نریندر کو جیسے کسی نے گولی مار دی، جو اس کے سینے کے پار ہو گئی۔ اُس،

نے مسکین آواز میں کہا "جی نہیں ——— جی نہیں"

"کیا ہوا ——— ؟ کیا ہوا ——— ؟" دوسری لڑکی نے پوچھا۔ نریندر کا دل بیٹھنے لگا۔

"بات کیا ہے رجنی بہن ——— ؟" اُدھر بیٹھے ہوئے نوجوان نے کڑی آواز سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں ...." رجنی بولی "بیٹھے بیٹھے حضرت نے میرا کندھا دبا دیا۔ مجھے ایسی ویسی سمجھ رکھا تھا بدمعاش، غنڈہ ......"

"جی نہیں ......" نریندر کچھ اور نہ کہہ سکا۔ قریب بیٹھے ہوئے کچھ تماشائیوں نے یہ سرگوشی دیکھی تو سر اُٹھا اُٹھا کر اسی طرف اندھیرے میں گھورنے لگے۔ نریندر شرم و ندامت سے گڑا جا رہا تھا۔

اُن کی اس بے موقع گفتگو سے تماشائیوں کا مزہ کرکرا ہونے لگا۔ اور چاروں طرف سے "چپ رہو، خاموش، خاموش، شور نہ کرو" کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس وقت چپ رہو رجنی ———" لڑکیوں کے ساتھ کے نوجوان نے کہا "انٹرول ہونے پر اس کی خبر لوں گا۔"

کچھ منٹوں کے لئے بات دب گئی لیکن انٹرول ہونے میں اب دیر ہی کیا تھی۔ نریندر کے حواس بجا نہ تھے۔ وہ بالکل نہ سمجھ سکا کہ آگے پردے پر کیا ہوا ———؟ لوگ تصویر کے حسین مناظر اور پرلطف مکالمے سے لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن نریندر سوچ رہا تھا۔ کاش انٹرول کی نوبت ہی نہ آتی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ نریندر کے لئے مشکل وقت قریب تر آتا جا رہا تھا۔

ایک بار نریندر نے سوچا۔ یہاں سے اُٹھ کر کہیں اور جا بیٹھے، لیکن کہیں جگہ بھی تو خالی نہ تھی۔ اور ہال چھوڑ کر ایک دم بھاگ جانا بھی ممکن نہ تھا کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ رجنی نام کی یہ ناگن لڑکی اسے ہرگز نہ ہلنے دے گی۔

کچھ دیر کے بعد ہال کی ساری بتیاں ایک ساتھ جگمگا اُٹھیں اور سارے ہال کی تاریکی سمٹ کر نریندر کے دماغ میں سما گئی۔ رجنی کا بھائی اُٹھ کر نریندر کے پاس آیا اور بھویں ٹیڑھی کر کے بولا "کیا بات تھی حضرت ——؟"

نریندر کچھ نہ بول سکا۔

"میں چُپ چاپ بیٹھی تصویر دیکھ رہی تھی۔ کہ اُنھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے جھنجوڑ دیا" لڑکی نے کہا۔

"میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں رجنی" اُس کے بھائی نے کہا "اِنھیں جواب دینے دو"

"جی...... " نریندر کو تقویت سی محسوس ہوئی "حقیقت یہ ہے کہ .... مجھے دھوکا ہوا...... میں اکثر دوستوں کے ساتھ سنیما دیکھنے آتا ہوں۔ مجھے ذرا بھی خیال نہ رہا کہ آج تنہا ہوں پردے پر مضحکہ خیز منظر دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتا ہُوا اپنے کسی ساتھی کے دھوکے میں ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دینے کی غلطی کر بیٹھا مجھے اس کے لئے افسوس ہے......"

"یہ بالکل غلط ہے" رجنی نے کہا "سراسر حیلہ ہے"

"نہیں نہیں ——" اس کا بھائی بولا "ایسا ہو سکتا ہے، یہ ناممکن نہیں"۔

"پھر بھی آپ سے معافی خواہ ہوں" - نریندر نے رجنی سے کہا۔

"خیر، کوئی بات نہیں"۔ اس کے بھائی نے کہا۔ "جانے دیجئے اور رجنی تم جلوہ میری جگہ پر بیٹھو۔"

رجنی اٹھی اور نریندر کو گھورتی ہوئی اُدھر جا بیٹھی۔ اور اس کی جگہ اس کا بھائی بیٹھ گیا۔

جو بات نریندر اندھیرے میں نہ سمجھ سکا تھا وہ اب سمجھ میں آئی۔ اُس نے دیکھا ان تینوں لڑکیوں میں سب سے حسین رجنی ہے۔

جگہ بدل کر مطمئن نوجوان نے نریندر سے ادھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

نریندر نے پوچھا "آپ سگریٹ پیتے ہیں؟"

"عادی تو نہیں اور یوں ——— پی لینے سے انکار بھی نہیں"۔ نوجوان نے ہنس کر کہا۔

پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نریندر نے ایک پیکیٹ نکالا، ایک سگریٹ اُسے دیا اور ایک خود لے کر دیا سلائی جلائی اور دونوں نے مُنہ قریب کر کے ایک ساتھ ہی اپنے اپنے سگریٹ جلائے اور دھوئیں کے ساتھ بہت سی باتیں اُڑنے لگیں۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں ———؟" نریندر نے پوچھا۔

"مجھے لوگ سریش کمار کہتے ہیں"۔ نوجوان نے کہا۔ "اور آپ کا نام ———؟"

"جی؟" نریندر نے ہنس کر کہا۔ "میرا نام کچھ چھوٹا سا ہے، نریندر ———"

"خوب!" سریش نے کہا۔ "آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی"۔

"اور آپ سے مل کر میری ایک مشکل آسان ہو گئی"، نریندر نے اپنی زندہ دلی

کا اظہار کیا۔ ادھر رجنی اس چٹکی پر کڑھی، لیکن نریندر کو اس کا اندازہ نہ ہو سکا۔

باتوں کے سلسلے میں مسز شرما نے نریندر سے اس کا پتہ بھی پوچھ لیا۔ لیکن نریندر اس کا پتہ نہ پوچھ سکا۔ اسے جرأت نہ ہوئی۔ وہ ڈرتا تھا کہ اس کا پتہ پوچھنے سے رجنی کا گھر جاننے کی خواہش کا اظہار ہو گا۔

لیکن نریندر کو اپنی جرأت کی کمی کے لئے زیادہ دنوں تک پچھتانا نہیں پڑا۔ ایک روز رجنی سے پھر ملاقات ہو گئی اور عجیب اتفاقی طور پر۔ ہم اس ملاقات کو چھوٹی سی مڈبھیڑ کہہ سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

نریندر کو کسی کام سے رتن گنج جانا تھا۔ اسے یکے کی تلاش تھی۔ ایک یکے والے نے آواز لگائی "ایک سواری رتن گنج کو" نریندر اسی طرف لپکا۔

"چھ پیسے بابو جی!" یکے والے نے کہا۔

یکے والے کے ساتھ آگے ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اور بغل میں کوئی عورت دوسری طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔ نریندر کو کیا خبر تھی کہ یہ رجنی ہو گی۔ اس نے ایک عورت کی موجودگی میں یکے والے سے مول بھاؤ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اُچک کر یکے پر بیٹھ گیا۔

یکہ جھٹکے سے ہلا۔ رجنی نے مڑ کر دیکھا تو نریندر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

—— یکے والے نے لگام سنبھالی۔ گھوڑے نے قدم بڑھانا چاہا۔ رجنی بولی۔

"مجھے اتر جانے دو"

"کیوں ——؟" یکے والے نے پوچھا۔

"میں کسی مرد کے ساتھ بیٹھ کر نہیں جانا چاہتی۔"

نریندر کا منہ چھوٹا سا ہو گیا

"آپ نے پورا یکہ تو کیا نہیں بی بی جی!" یکّے والے نے کہا۔ اس بات سے نریندر کو کسی قدر اطمینان ہوا۔

"اسی لئے تو میں خود اُتر ی جا رہی ہوں۔" رجنی نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں، آپ بیٹھی رہیں!" یکّے والا بولا۔ "آپ نے اگر پہلے کہہ دیا ہوتا تو میں بابو صاحب کو نہ بٹھاتا اب تو یہ بیٹھ ہی گئے۔"

"نہیں!" رجنی اپنی ضد پر قائم رہی۔ "میں دوسرے یکّے پر بیٹھوں گی۔"

"لیکن میں جو آپ کو اتنی دُور سے اڈّے تک لایا ہوں وہ؟" یکّے والے نے کہا۔

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم جسے چاہو بٹھالو اور میں اُس کے ساتھ بندھی رہوں!" رجنی نے غصّے سے کہا۔

"بی بی! یہ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں!" یکّے والے نے نرم لہجے میں کہا۔

"تم کیا جانو!" رجنی نے ایک اچٹتی نگاہ نریندر پر ڈال کر کہا۔

"تم کیا جانو" کے دو معنی ہوئے۔ یکّے والے نے تو سمجھا کہ تم سے ان کی جان پہچان تو ہے نہیں، پھر ان کے بارے میں کیسے کہہ سکتے ہو ——؟ اور نریندر نے اُس کے اس طنز میں سینما کے واقعہ کی جھلک محسوس کی جس سے اُس کا دِل تلملا اُٹھا۔

"دیکھنے سے آدمی کی اصلیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ بابو صاحب کو یُوں کوئی

بُرا نہیں کہہ سکتا۔" یکّے والے نے نریندر کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"نہ بابو صاحب کو بُرا کہہ سکتا ہے نہ تمہیں!" رجنی نے چُٹکی لی۔ سوچا چور کا گواہ گرہ کٹ۔ یکّے والا نریندر کا مُنہ دیکھنے لگا۔

"زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اتنی دُور کا جو کرایہ چاہو مجھ سے لے سکتے ہو، مَیں اس طرح نہیں بیٹھ سکتی، سمجھے؟" رجنی نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

"ایسا ہے تو بابو صاحب آپ اُتر کر کسی دُوسرے یکّے پر بیٹھ جائیے" یکّے والے نے نریندر کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

نریندر آہستہ سے اُتر پڑا۔ بہت مشکل سے رجنی نے ایک بُوڑھے کو بیٹھنے دیا اور یکّہ چل پڑا۔ کوئی دُوسرا یکّہ تیار نہ تھا۔ نریندر اس وقت انتظار نہ کر سکا۔ وہ بے طرح جھنجھلایا ہُوا تھا۔ اُس نے ایک پُورا تانگہ کر لیا۔ یہاں آن کا سوال تھا آٹھ آنوں کی کوئی بات نہ تھی۔

کچھ منٹوں میں تانگہ یکّے سے آگے ہو رہا۔ "بہت تیز نہ لے چلو" نریندر نے کہا اور حیلہ کیا کہ "میری طبیعت اچھی نہیں ہے"

تانگہ یکّے کے آگے آگے ساتھ چلنے لگا ـــــــ

یکّے والے نے نریندر کو دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر مُسکرا دیا۔ نریندر کے تنہا تانگے پر پاؤں پر پاؤں پھیلا کر بیٹھنے کے انداز سے رجنی بہت جھینپ رہی تھی۔

نریندر رہ رہ کر رجنی کی طرف دیکھتا، لیکن وہ تانگے کی طرف نہ دیکھتی۔ ایک بار نریندر کی دزدیدہ نگاہ پر رجنی کی نگاہ پڑ گئی۔ نریندر کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کا طیارہ دشمن کی سرحد میں تاریکیوں میں گُم اُڑ رہا تھا کہ اُس پر دفعتاً حریف کی سرچ لائٹ

کی تیز روشنی پڑ گئی ہو، اور وہ طیارہ شکن مشین گن کا نشانہ بن گیا ہو۔

رتن گنج پہنچ کر ایک مکان کے سامنے یکہ رُکا۔ نریندر نے آخر یہی کا مکان دیکھ ہی لیا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اب نریندر کو اکثر ایسی ضرورت پیش آنے لگی جس کے لئے اُسے ہر بار رتن گنج جانا پڑتا اور اکثر اُس مکان کے سامنے سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ کیا کرتا مجبور تھا۔

اُس کے باپ کو بے حد حیرت تھی کہ جو لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے، نئی تہذیب کے جھولے میں جھول رہا ہے، وہ یکایک ایسے مہاجنی کاروبار میں کیسے دلچسپی لینے لگا ـــــــ؟ پہلے تو اُسے اس کام سے بہت ہی نفرت تھی۔ اب وہی نریندر اتنے نوکر چاکر ہوتے ہوئے کہنے لگا "اگر رتن گنج کی طرف کا کوئی کام ہو تو بتائیے کرتا آؤں، ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

اُسی محلے کو لڑکے نے اپنے کام کے لئے کیوں منتخب کیا ـــــــ؟ یہ بات باپ کے لئے ایک پہیلی تھی۔ اُنھوں نے سوچا۔ اسی طرف اسکول کی یونیورسٹی ہے۔ اس لئے اسے سہولت ملتی ہوگی۔

نریندر کے باپ کے پاس دولت کے ساتھ ساتھ سادگی بھی تھی، غرور و تمکنت کی تو انہیں ہوا تک نہیں لگی تھی۔ سماج کی اصلاح اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ شہر میں اُن کی سونے چاندی اور زیورات کی بہت بڑی دکان تھی۔ ان کے یہاں لین دین بھی ہوتا تھا۔ ہیرے موتیوں کا کاروبار بھی بڑے پیمانے پر ہوتا

تھا۔ لاکھوں کے آدمی تھے۔ پھر بھی صاحبزادے کو معمولی کاموں میں ہاتھ ڈالنے
کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آسکی۔

نریندر رتن گنج کا چکر ضرور لگاتا تھا لیکن اُس خاص مکان کے سامنے رُکتا
نہ تھا۔ وہاں اُس کے قدم ٹھہرتے ہی نہ تھے۔ ہاں دل البتہ دھڑک کر کہتا "یہیں
ڈیرہ ڈال دو ——— !"

ایک دن قسمت نے اُسے کافی سہارا دیا، جرأت بخشی اور وہ کچھ دیر کے
لئے اُس مکان کے سامنے رُکا، کچھ جھجکا، پھر آہستہ آہستہ برآمدے میں جا کھڑا ہوا۔

ہُوا یوں کہ نریندر کے وہاں پہنچتے پہنچتے گھرے ہوئے بادلوں کی فوج کے
ضبط کا بند ٹوٹ گیا۔ اور یک بیک بڑی بڑی بوندوں کا ہوائی حملہ ہونے لگا۔ نریندر
کے لئے کہیں پناہ لینا ضروری ہو گیا۔

رجنی برکھا کی بہار دیکھنے باہر نکلی تو اُس نے تعجب سے پوچھا۔ "آپ ———؟"

"آں ...... جی ...... جی ہاں" نریندر نے جواب دیا۔ پھر سوچا اس
"آپ" میں کیسے؟ کیوں ———؟ اور کس لئے بھی پوشیدہ ہے۔ اُس نے کہا "جی
اتفاق سے بارش ہونے لگی۔ تو میں نے سوچا جی، ذرا یہیں ٹھہر جاؤں ......"

"جی! " رجنی بولی "ایسے اتفاقات اپنے آپ نہیں پیش آیا کرتے۔ تلاش و
تجسس اور انتظار کے ذریعے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔"

"جی ———؟" نریندر نے بوکھلا کر کہا۔ رجنی کی چُٹکی اُس سے چُھپی نہ رہی۔

"میں کہتی ہوں" رجنی نے تیز ہو کر کہا "آپ میرے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"

"جی نہیں، جی نہیں ......" نریندر نے گھبرا کر کہا "میں آپ کے بھائی

مسٹر شیو کمار جی سے ملنے آیا ہوں۔"

"لیکن آپ نے ابھی تو کہا تھا کہ پانی سے بچنے کے لئے یہاں آگیا ہوں۔"

"جی، ایک ہی بات ہے، محض اتفاق......"

"آپ کے اتفاقات کا کیا کہنا ہے ——— اس دن مجھے بیٹھے دیکھ کر جو آپ بھی اسی یکّے پر آ دھمکے تھے، وہ بھی اتفاق ہی تھا، کیوں ———؟"

"جی، جی، مجھے پہلے سے علم نہ تھا کہ اُس پر آپ بیٹھی ہیں۔"

"بجا فرمایا، اور اُس روز سنیما میں آپ کا ہاتھ بھی اتفاق ہی سے میرے کندھے پر پڑ گیا تھا؟"

نریندر کے پاس کوئی جواب نہ تھا ———

"خیر......" رجنی نے کہا۔ "آپ بھائی صاحب سے ملنے آئے ہیں نا۔"

"جی......"

"تو بھائی صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ کہیں گئے ہیں اس لئے آپ جا سکتے ہیں۔"

"جی، لیکن......" نریندر نے کہا۔ اور آنکھوں سے اشارہ کیا کہ بارش ہو رہی ہے۔

"پانی میرے کہنے سے تو بند ہوگا نہیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔" رجنی نے نہایت خشک انداز سے کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہ آسکا کہ جب آپ آس پاس کے دوسرے مکانوں میں بھی جا کر بھیگنے سے بچ سکتے تھے۔ تو آپ نے اسی کُٹیا میں آنے کی تکلیف گوارا کرنا کیوں پسند فرمایا ———؟"

نریندر نے پھر نہیں کہا کہ سریش سے ملنا تھا، اس لئے آیا تھا ـــــــــ
چُپ چاپ وہاں سے نکل پڑا، اُسے بُوندوں کی بُوچھاڑ کی اتنی پرواہ نہ تھی جتنی
الفاظ کی بوچھاڑ کی ـــــــــ!

رجنی نے پکارا: "اچھا ذرا سُنئیے تو"! لیکن بُوندوں کے شور میں اس
کی آواز گم ہو کر رہ گئی۔

* * * * *

ایک دن سریش کمار نریندر کے پاس آیا۔ اُس نے سوچا شاید بہن کی طرف
سے شکایت لے کر آئے ہیں۔ اس نے خشک انداز سے پُوچھا "کہئے کیسے آئے؟"
سریش کچھ جھینپتا ہوا بولا: "کچھ سونے کے زیور لایا ہوں، انہیں فروخت
کرنا ہے، میں اس بارے میں بالکل کورا ہوں۔ سوچا کسی ایسے ویسے کے پاس
جاؤں گا۔ تو اُلٹی چُھری کر دن پہ پھیر دے گا، پھر آپ کا خیال آیا، مہربانی کر کے
ذرا اپنے پتاجی سے کہہ دیجئے۔"

نریندر مزید تفصیل معلوم کئے بغیر سریش کو اپنے باپ کے پاس لے گیا۔
"ابھی تو یہ گہنے پہننے کے لائق ہیں۔" نریندر کے باپ نے کہا۔ "گلے ہوئے
سونے کے بھاؤ سے بکیں گے۔ بنوائی ضائع چلی جائے گی۔ انہیں کیوں بیچ
رہے ہیں ـــــــــ؟"

"کیا بتاؤں"۔ سریش کی آواز کے ساتھ غم و اندوہ کے تار بج رہے تھے۔
ـــــــــ "یہ زیور میری بیوی کے ہیں، انہیں پتاجی نے بڑے شوق سے بنوایا
تھا۔ اب پتاجی رہے نہیں، بہن کی شادی کرنی ہے......"

"رجنی کی ——؟" نریندر نے چونک کر کہا۔

"ہاں"۔ سریش کہتا گیا "ایک جگہ طے ہوئی ہے۔ کہنے کو تو کہتے ہیں جہیز نہیں لیتے۔ لیکن لڑکے کو ولایت بھیجنے کا خرچ مانگتے ہیں۔ ہماری سماج میں ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہیں......"

نریندر کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اُس نے ایک گہری سانس لی، شاید اس لئے کہ اُسے جہیز کی بات سے دُکھ ہوا۔

سریش نے پھر کہا "لڑکا اچھا ہے، خاندان بھی اچھا ہے۔ چھوڑتے نہیں بنتا، پڑھی لکھی لڑکی کسی ایسے ویسے کو سونپی نہیں جا سکتی، آپ خود سمجھ سکتے ہیں"۔ نریندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا "رجنی کتنی لائق اور کتنی نازک مزاج ہے......"

نریندر کو سر ہلا کر تائید کرنی پڑی۔ لیکن اُس کا تاثر چھپا نہ رہ سکا۔ آنکھوں میں تیرنے لگا۔

نریندر کے باپ کبھی نریندر کی طرف دیکھتے کبھی سریش کی طرف۔ "آپ کہاں رہتے ہیں ——؟" انھوں نے سریش سے پوچھا۔

"رتن گنج میں......" جواب ملا۔

"ر...... تن...... گنج میں......" نریندر کے باپ نے دُہرایا۔

"جی ہاں"۔

"تو آپ بہن کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے غریب بیوی کے ہاتھ سونے سے خالی کرتے آئے ہیں ——؟"

"اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے ——؟" سرلیش نے مسکین آواز میں کہا۔

"یہ اس لیئے کہ جہیز سے مُنہ موڑنے والے کسی بھلے آدمی کے نورِ نظر کو ولایت کی سَیر کے لیئے خرچ چاہیئے؟"

سرلیش کچھ نہ بولا

"اچھا سوچوں گا اس بارے میں کیا کیا جا سکتا ہے"

وہ جب تک سوچتے رہے۔ سرلیش یاس و اُمید کے جھولے میں جھولتا ہوا اُن کی صُورت دیکھتا رہا۔

"شاید ایک تدبیر سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

سرلیش کی صُورت پر کچھ نہ سمجھنے کا انداز تھا۔ لیکن نگاہوں میں اُمید جھلک رہی تھی۔

"یہی ٹھیک ہو گا......"

سرلیش اُسی انداز سے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہاں" نریندر کے باپ نے کہا "نریندر تُم جاؤ"

نریندر سر جھکائے ہوئے افسُردہ خاطر سا چلا گیا۔ سرلیش ذہن پہ بہت کچھ زور ڈالنے پر بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

نریندر کے باپ نے سرلیش کے دِل سے جہیز کی فکر دُور کر دی اور اس کی بیوی کے گہنے اسے واپس کر دیئے۔ سرلیش نے متشکر نگاہوں سے اُن کی طرف دیکھ کر کہا "میں آپ کے احسان کے بوجھ سے دبا جا رہا ہوں، میں تو آپ کی

حیثیت دیکھ کر شادی کے متعلق لب کشائی کی بھی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اگر میں جانتا ہوتا کہ دھن والے دیا لو بھی ہو سکتے ہیں تو آپ کے پاس پہلے ہی آتا۔"

"اچھا اچھا جاؤ، بوڑھے کو نہ بناؤ۔"

* * * * * *

"تم مجھے ہوا سمجھتی تھیں ــــ؟" نریندر نے رجنی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کیا غلط سمجھتی تھی؟" رجنی اپنے آنچل کا کونہ انگلی میں لپیٹتی ہوئی بولی۔

"کیوں ــــ؟"

"جس بات سے ڈرتی تھی وہی سامنے آئی۔" رجنی نے شرماتے ہوئے زیر لب مسکرا کر کہا۔

دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے

"لیکن سچ پوچھو تو ہوا تم تھیں۔"

"وہ کیسے؟" رجنی نے نریندر کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی بے چارے کا سنیما دیکھنا مشکل کر دیا۔ اسے یکے پر سے اتارا اور برستے پانی میں گھر سے نکالا۔ پھر بھی پوچھتی ہو کیسے؟"

"کوئی بے چارہ بڑا بھولا تھا نا؟ کیا کہنے ہیں؟"

رجنی نے نریندر کی طرف غلط انداز نگاہوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

(شری سکھارنی کی ہندی کہانی سے)
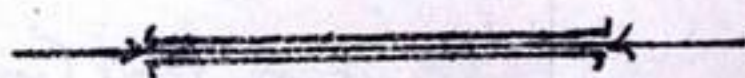
رازِ عشق

کمل اور شانتا کماری دونوں انٹرمیڈیٹ کے سیکنڈ ائیر کے متعلّم تھے، دونوں میں بے حد اُنس تھا، دونوں کلاس میں ایک ساتھ ہی بیٹھتے اور موقع ملنے پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے، یہ سب کچھ ہونے پر بھی دونوں نے ایک دوسرے سے کبھی اظہارِ محبت نہیں کیا۔ اور نہ کبھی گھر پر ملاقات کی۔ اس نیک نیتی کے باوجود اُن کے ساتھ کے طلبہ اُن کے بارے میں برابر چہ میگوئیاں کیا کرتے لیکن اُن دونوں کا خیال اس طرف کبھی نہ جاتا۔ وہ سوچتے، جب ہمارے دِل صاف ہیں تو لوگوں کے اُنگلیاں اُٹھانے سے کیا ہوتا ہے؟

شانتا نسوانی حُسن وجمال کا دِل آویز پیکر تھی۔ اُس کا حسین مکھڑا، اُس کی

دل فریب مُسکراہٹ سے ہر وقت کِھلا رہتا تھا۔ کمل بھی ایک خوش رو نوجوان تھا۔ دونوں کی عمر میں بھی دو ہی ایک سال کا فرق تھا۔

کمل شاعر تھا اور اُس کی بیشتر نظمیں شانتا ہی سے متعلق ہوتی تھیں۔ وہ اپنی پُرکیف نظمیں والہانہ انداز میں شانتا کو سُناتا۔ وہ سُن کر جھوم جھوم جاتی۔ شانتا کے اصرار سے کمل اپنی نظمیں ایک ادبی ہفت روزہ "پریم" میں اشاعت کے لئے بھیجنے لگا۔ دو ہی تین نظمیں نکلنے کے بعد اُن پر تنقیدیں بھی شائع ہونے لگیں۔ اُس نے عام اور پامال راہ سے الگ ہٹ کر ایک جادۂ نو کی طرح ڈالی تھی۔ کمل کی نظموں پر تنقید کرنے والی ایک خاتون تھی چندر مُکھی! تنقید نگاری کے علاوہ کبھی کبھی چندر مُکھی کے افسانے بھی "پریم" میں شائع ہوتے۔ اُس کے بیشتر افسانے کمل ہی کی نظموں کی صدائے بازگشت ہوتے تھے۔

کمل اپنی نظموں پر توصیفی رائیں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور سخت تنقیدیں پڑھ کر چراغ پا ہو جاتا۔ یہ ساری تحریریں کمل، شانتا کو پڑھنے کے لئے دیتا۔ اُن دونوں میں خوب بحث و گفتگو ہوتی۔ دونوں میں شدید اختلاف رائے بھی ہوتا۔ لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اُنس و محبت میں سرِ مُو فرق نہ آتا۔ اُس میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی جاتی تھی۔

کمل بھی چندر مُکھی کی تنقیدوں کا جواب دیتا اور اسے اشاعت کیلئے "پریم" ہی میں بھیجتا۔ آہستہ آہستہ چندر مکھی کی تنقید سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔ جواب میں کمل کا قلم بھی شعلے اُگلنے لگا۔

اسی طرح دو سال تک "پریم" کمل اور چندر مکھی کے لئے ادبی میدانِ رزم

بنا رہا۔ شانتا ان کی معرکہ آرائیوں سے خوب لطف اندوز ہوتی تھی کبھی وہ چندر مکھی کی حمایت و تائید میں بول کر اس کی تعریف کرتی اور کبھی کمل کو سراہتی شانتا کے منہ سے اپنے حریف کی تعریف و تحسین سن کر کبھی کبھی کمل اسے برا بھلا بھی کہہ دیا کرتا۔ شانتا ہنس کر ٹال دیتی اس کے ہنسنے پر کمل بھی ہنس دیتا۔ اس کا غصہ کافور ہو جاتا اور شانتا کو خوش کرنے کے لئے اس کی توصیف میں کوئی نظم لکھ کر اسے سناتا۔ شانتا اسے "پریم" میں اشاعت کے لئے بھیجتی۔ اس طرح آہستہ آہستہ کمل دنیائے ادب میں کافی شہرت کا مالک ہو گیا۔

چندر مکھی کا شمار بھی مشہور ناقدین اور فسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ دنیائے ادب و صحافت میں دونوں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے لگے۔

* * * * *

دو سال کے بعد

پٹنہ میں کل ہند ادبی کانفرنس کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ اس سلسلے میں نظموں اور افسانوں کے مقابلہ کی بھی تجویز پاس ہوئی۔ اس میں شامل ہونے کیلئے ملک کے ادباء اور شعرا کے ساتھ کمل اور چندر مکھی کو بھی دعوت نامے ملے۔

اپنے ذوقِ بیتاب کی تسکین کا سامان پاکر کمل بہت خوش ہوا اور اس نے ساتھ چلنے کے لئے شانتا کو بھی رضامند کیا۔ وہ انکار نہ کر سکی۔ اور اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ چلنے کے لئے آمادہ کر لیا۔

اسٹیشن پہنچ کر ایک ادبی ماہنامہ کے مدیر سے معلوم ہوا کہ مشہور ناقدہ و ادیبہ چندر مکھی بھی اس کانفرنس میں آرہی ہیں، یہ بھی ان کا نادیدہ مداح اور دیرینہ

عقیدت مند ہے کمل نے دھڑکتے ہوئے دل سے شانتا سے کہا۔" لو تمہاری تمنّا کی قیمت وصول ہو گئی۔ تمہاری چندرمکھی بھی آ رہی ہے۔"

"بہت خوب۔ اس شوخ نگار ادیبہ کے دیکھنے کی مدت سے آرزو تھی۔" شانتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بھی عرصے سے اپنے حریف کو دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ اس کی نیش زنی پر کبھی کبھی غصّہ تو ضرور آتا ہے، لیکن اس کا اندازِ بیان اتنا دِل نشین اور دل کش ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ وہ مجھے ہمیشہ یوں ہی گالیاں دیا کرے۔

دُشنام دوست طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکتِ آوازِ دیکھنا!"

"اچھا یہ بات ہے ——— آج معلوم ہوا کہ تم اس سے محبت بھی کرنے لگے ہو۔"

"بھلا میں اس سے کبھی محبت بھی کر سکتا ہوں؟ اگر پاؤں تو.... " کمل کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر بولا " اس نے ساری دنیا میں مجھے بدنام کر رکھا ہے، مجھے اس سے محبت ہو گی؟ شانتا تم بھی زخم پر نمک پاشی کرتی ہو ———!"

"ہاں ہاں یہی تو محبت کی علامت ہے۔ اسے دیکھنے کی آرزو ——— اس سے ملنے اور بولنے کا شوق ——— اور دوسروں کو دھوکا دینے کیلئے اُسے بُرا کہنا ——— ، اسی طرح آہستہ آہستہ آرزوئیں اور تمنّائیں پرورش پاتی رہتی ہیں اور یہی رنگین تمنّائیں ایک دن محبت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ——— اور پھر شادی ہو جاتی ہے ——— کیوں کمل! میں نے غلط تو نہیں کہا؟ ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا۔" شانتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"واہ، تم تو شاعری کرنے لگیں۔ معلوم ہوتا ہے نظموں کے مقابلے کا انعام تم ہی لو گی" کمل نے شانتا کی طرف دیکھ کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے ــــــ مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مجھے اس طرح کھری کھوٹی سنانے والی کیسی عورت ہے اور بس"۔

"تو میں نے ادھر کیا کہا ــــــ؟ اگر اجازت ہو تو اس سے ملانے کی کوشش کر دوں"۔

"اچھا تو تم نے بھی مجھے ستانا شروع کر دیا؟ شانتا! اگر تم بُرا نہ مانو تو تم سے ایک بات کہوں"۔

"یہی نا کہ تم چندر مکھی سے محبت کرنے لگے ہو؟ اور اس نے بھی نذرِ محبت کو قبول کر لیا ہے۔ کیوں کمل بابو ہے نا یہی بات ــــــ؟"

"اوہ، تم یہ کیا واہی تباہی بکنے لگیں، تم نے تو مجھے ایک دم اُلٹا ہی سمجھ لیا۔ معلوم نہیں آج تمہیں کیا ہو گیا ہے جو اس طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔ شانتا اگر تم بُرا نہ مانو تو میں اپنے دل کا ایک راز جسے تین سال کی طویل مدت سے اپنے دل میں دبا رکھا ہے تم سے کہہ دوں"۔

"یہی نا کہ میں تمہاری اور چندر مکھی کی راہ کا کانٹا بن رہی ہوں ــــــ؟" شانتا نے کمل کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی بات ــــــ؟ شانتا! میں تمہیں سے محبت کرتا ہوں ــــــ!" کمل سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکل پڑا۔

"خوب! چندر مکھی کا راز چھپانے کے لئے مجھی سے محبت کرنے کا ڈھونگ

رچانے لگے، کیوں نہ ہو، شاعر جو ہو۔ شاعروں کو بہت دُور کی سُوجھتی ہے۔ میں تمہاری یہ بات کبھی نہیں مان سکتی، تمہیں چندر مُکھی ہی مُبارک ہو! اور پھر میں یا کوئی اور تمہیں اس کے لئے بُرا تو کہہ نہیں سکتا؟" شانتا نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

یہ بات شانتا نے کچھ اس انداز سے کہی کہ کمل تڑپ اُٹھا۔ اس جوش میں وہ شانتا کو پکڑ لینا چاہتا تھا اور اسی نیّت سے وہ اس کی طرف جُھکا بھی۔ لیکن شانتا نے پیچھے ہٹ کر کچھ دُور بیٹھے ہُوئے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کر دیا ———— اور کمل سنبھل گیا۔

اس کے بعد اپنی صفائی دیتے ہوئے کمل شانتا سے اظہارِ محبّت کرنے لگا، لیکن شانتا بار بار چندر مکھی کا نام لے لے کر اسے چھیڑتی رہی۔

پٹنہ اسٹیشن پر اُتر کر وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ دُوسرے دن کانفرنس میں گئے۔ کمل نے ابھی حال میں لکھنا شروع کیا تھا، ملک کے ممتاز ادبا کی بھیڑ میں اُسے کون پُوچھتا کہ تم کون ہو؟ کمل اور شانتا ایک طرف بیٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ ہال ادبا سے بھرتا جا رہا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ کمل چندر مکھی کے دیکھنے کا مُشتاق تھا۔ اُس کی نگاہ جس عورت پر جاتی، وہ اسے چندر مکھی ہی سمجھتا، اور شانتا سے اس کے بارے میں اس کا خیال پُوچھنے لگتا۔ شانتا اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے کہہ دیتی۔ یہ تو چندر مکھی ہونے کے لائق نہیں معلوم ہوتی۔ یہ چندر مکھی نہیں ہو سکتی، اسی طرح کانفرنس میں جتنی خواتین موجُود تھیں کمل نے باری باری سب کے بارے میں اُس کا خیال پُوچھا۔ اور

شاآنتا نے کسی کو چندر مکھی ہونے کے لائق نہ سمجھا، تو کمل مایوس ہو گیا۔ اُس نے اُسی بے دلی کے عالم میں قریب بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں سے پوچھا۔ انھوں نے بھی کسی کا کچھ اور کسی کا کچھ نام بتایا۔ اور کسی کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسی طرح کمل دیر تک یاس اور اُمید کے جھولے میں جھولتا رہا۔

کانفرنس شروع ہوئی۔ آج کا دن صرف افسانوں کے مقابلے کیلئے مخصوص تھا۔ کچھ لوگوں کے بعد صدر نے چندر مکھی کا نام لیا تو کمل کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ ادھر ادھر مشتاق نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ شاآنتا نے کمل کی طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی اسٹیج کی طرف بڑھی۔ کمل کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔

شاآنتا آہستہ آہستہ چل کر اسٹیج پہ پہنچ گئی۔ کمل سر نیچا کئے خیالات کی دُنیا میں کھو گیا۔ اب وہ شاآنتا کی طرف نہ دیکھ سکا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا اُف! اتنا دھوکا ——! شاآنتا میرے ہی ساتھ رہ کر مجھے اب تک طرح طرح سے دھوکا دیتی اور بیوقوف بناتی رہی؟

شاآنتا نے بے حد دل کش انداز میں ایک بلند پایہ نفسیاتی افسانہ سُنایا۔ اُس کا عنوان تھا "رازِ عشق"! افسانہ کیا تھا دو پریمیوں کی حیرت زا رومانی سرگزشت تھی! یہ افسانہ اتنے دِل کش پیرائے اور دل آویز انداز میں لکھا گیا تھا کہ سُن کر بڑے بڑے کہنہ مشق فنکار عش عش کر اُٹھے۔ افسانہ ختم ہوتے ہی ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں اور ساتھ ہی کئی ادب نواز شخصیتوں نے طلائی تمغے پیش کرنے کا اعلان کیا۔

شاآنتا افسانہ ختم کر کے مُسکراتی اٹھلاتی آہستہ آہستہ اسٹیج سے اُتر کر پھر

کمل کی بغل میں آ بیٹھی۔ اِدھر کمل سر نیچا کر کے بیٹھا تو پھر سر نہ اُٹھا سکا۔ وہ اسی طرح میز پہ ہاتھ رکھ کر اور اسی پہ اپنا ماتھا ٹیک کر بیٹھا لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ شانتا نے کمل کو بُلایا، لیکن کمل اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر شانتا بھی چُپ چاپ بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اس نے آج کمل کے دل کو بہت ٹھیس لگائی ہے۔ پھر وہ کمل کی طرف دیکھ کر ہنستی اور اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن کمل اسی طرح بےحس و حرکت بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اُس روز کی کارروائی ختم ہوئی اور لوگ چلنے لگے، سب کی زبان پر چندر مکھی کی تعریف و تحسین تھی۔ آج جتنے افسانے سُنائے گئے سب میں چندر مکھی ہی کا افسانہ ہر اعتبار سے قابلِ ترجیح تھا۔ اپنی تعریف و تحسین سُن سُن کر شانتا کو بے اندازہ مسرت ہو رہی تھی۔ لیکن کمل کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتی، بہت سی خواتین اور مردوں نے شانتا کو مبارک باد دی۔ اس نے بھی اُن کی قدر افزائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ جب مبارک بادیوں کا شور کم ہوا تو شانتا نے کمل کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا۔ وہ چُپ چاپ اُٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پھر بھی اُس نے شانتا کی طرف نہ دیکھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر وہ چُپ چاپ چارپائی پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ شانتا کو بہت افسوس ہوا، اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ــــــ؟ رات کو اُس نے بھی کچھ نہ کھایا اور چُپ چاپ سو رہی۔

* * * * *

دوسرے دن نظموں کا مقابلہ تھا۔ کسی طرح شانتا کمل کو آمادہ کر کے

پنڈال میں لے گئی۔ کمل اُسی طرح خاموش تھا۔ اور شانتا کی طرف بھی نہ دیکھتا تھا۔ کمل نے کانفرنس میں پڑھنے کے لئے جو نظم لکھی تھی۔ اُسے شانتا کو پہلے ہی سُنا چُکا تھا۔ شانتا نے بہت سراہا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ دُوسرے سُننے والے بھی اسے بہت پسند کریں گے۔ لیکن کمل کی یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائی اور اُس نے سوچا کہ اگر کمل نے پڑھنے سے گریز کیا تو وہ خود پڑھے گی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ صدر نے کہا۔ "کمل صاحب تشریف لائیں، لوگ مشتاق ہیں۔" اپنا نام سُنتے ہی اور شانتا کے اشارہ کرتے ہی کمل اُٹھا، چل کر اسٹیج پہ چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اُسے خاموش دیکھ کر اِدھر شانتا گھبرائی۔ اُدھر صدر نے بھی کہا۔ "ہاں کمل صاحب! آپ اپنی نظم سنائیں، لوگ مشتاق ہیں۔"

یہ سُن کر کمل چونکا اور بولا۔ "جی ہاں عرض کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ سنجیدہ انداز سے بولا "حضرات میری نظم کا عنوان ہے "رازِ عشق"!" اتنا کہہ کر اُس نے ایک بار شانتا کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں اتنی کشش —— اتنی تمکین —— اور اتنی چمک تھی کہ شانتا دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے آج تک کمل کی آنکھوں میں یہ تمکین کبھی نہ دیکھی تھی۔

کمل اپنی نظم سنانے لگا۔ وہ نظم کیا تھی، جیسے کمل نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس نے شانتا ہی کے افسانے کا جواب دیتے ہوئے اس دلکش انداز میں محبّت کی نفسیات پر روشنی ڈالی تھی کہ سُننے والے بھی اُس کے ساتھ جھوم اُٹھے۔ سب پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی، شانتا کا تو پُوچھنا ہی کیا تھا۔ اس کا دِل وفورِ مسرت سے لبریز ہو رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں

محبت کے آنسو چھلک رہے تھے وہ بھی از خود رفتہ سی کیف و سرور میں کھوئی ہوئی، ڈوبی ہوئی سن رہی تھی۔ آج تک اس نے کمل کو ایسی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

کمل کے خاموش ہوتے ہی مدہوش تاثر سامعین نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے اور کمل کو بھی قدر افزائی کے طور پر کئی طلائی تمغے پیش کرنے کا اعلان ہوا۔

کمل نے جو نظم سنائی تھی۔ وہ اُسی وقت قلم برداشتہ لکھی تھی۔

کمل کو طلائی تمغے پاکر اتنی خوشی نہیں ہوئی، جتنی چندر مکھی کو پاکر! یہ بات شانتا سے چھپی نہ تھی ——— ہوٹل میں آکر اس نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا

"میں کہتی تھی نا کہ تم اپنی چندر مکھی کی محبت کا راز چھپانے کے لئے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچانے لگے ہو۔ آب تو رنگے ہاتھوں پکڑے گئے!"

کمل مسکرا دیا۔ شانتا کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں +

شاعر کا گناہ

"اندو رانی؟"

"ہوں آئی"

"دیر ہو رہی ہے"

"بس آ ہی گئی"۔

دیوار سے لگا ہوا آئینہ راجکماری اندو سے کچھ اونچا تھا۔ ایک اندو آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ دوسری اُس کے سینے سے لگی ہوئی، اگر باہر کی اندو چاند تھی تو اندر کی چاندنی تھی۔ راجکماری اندو نے شانہ اُٹھایا۔ ریشم کی تہہ سے

جمے ہوئے بالوں میں کنگھی کے دندانے گھس کر پیچھے نکل گئے۔ گداز مخملی رخساروں پر گلاب لیپ لگا کر اُس نے مست و مخمور آنکھوں سے آئینے کی طرف دیکھا اور پتلے گلابی ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے کہا۔ "اب بھی نہیں......"
سوچا ہار کے بغیر گلا سُونا لگ رہا ہے۔ اس لئے کھلے ہوئے صندوق سے موتیوں کا ہار نکالا۔ موتی کیا تھے۔ بڑے بڑے کابلی انگور تھے۔ ہار گلے میں ڈال کر ماتھے پر سُرخ ٹیکہ لگایا۔ سُونا چہرہ کھل اُٹھا۔ راجکماری سینہ اُبھار کر آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ حریف کو دیکھ کر آئینے کی ماہ وش حسینہ بھی تن گئی۔
"اندو رانی!" پُشپا نے پھر اونچی آواز سے پکارا۔ "بس آ گئی" کہتی ہوئی راجکماری نے ایک دزدیدہ نظر آئینے پر ڈالی اور اپنے حُسن پر خود ہی فریفتہ ہوتی ہوئی زینے سے نیچے اُتری۔
اندو راجکماری تھی پُشپا پردھان منتری کی بیٹی لیکن صناعِ قدرت نے ایسی جوڑی بنا دی تھی، کہ دونوں تُوام بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک ہی سِن ایک ہی رنگ۔ ایک ہی انداز۔ ساری باتیں ایک تھیں۔ سرِ مُو فرق نہ تھا۔
ہاں ایک بات تھی۔ اور اُسے کوئی بہت بڑا ماہر جمالیات ہی پکڑ سکتا تھا۔ راجکماری کی آنکھیں بڑی بڑی۔ گول گول۔ پلکوں کے بال اُٹھے ہوئے تھے۔ پُشپا کی آنکھیں کیا تھیں حسین چہرے پر بڑے بڑے دو بادام جڑے ہوئے تھے۔ پلکیں موسم برشگال کے بادل کی طرح جُھکی رہتی تھیں۔ پلکوں کے اندر ہی سے وہ ہر چیز کو دیکھ لیتیں۔ اُن کے سادگی سے دیکھنے پر بھی اجنبی شخص خود کو آشنا اور مانوس سمجھنے کی غلط فہمی میں مُبتلا ہو جاتا۔

ایک نے اپنا بایاں بازو دوسری کے دائیں بازو میں اُلجھایا۔ اور دونوں سہیلیاں دریا کے گھاٹ کی طرف چل پڑیں ——— اونگھتا ہوا بوڑھا ملاح چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور چپو پانی میں ٹیک کر کشتی کنارے پر لگا دی۔ گہرے گلابی رنگ سے رنگی ہوئی حسین ایڑیاں کشتی کے تختے پر گریں اور دونوں سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"اَن داتا! کہاں چلنا ہے؟" بوڑھے ملاح نے بڑھاپے سے خمیدہ کمر کو خادمانہ انداز سے اور بھی جھکا کر پوچھا۔

"ارے یہ تو ہم نے طے ہی نہیں کیا کہ آج کدھر کی سیر کی جائے"! اندو نے پُشپا کے کندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔ پُشپا کچھ سوچتی ہوئی خاموش رہی پھر بولی "اچھا مانجھی! آج اپنی طبیعت سے کسی سُندر استھان پر لے چلو"

"سُندر استھان تو کئی ہیں اَن داتا! جہاں مرضی ہو۔ لے چلوں"۔ ملاح نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"پہلے ہی کہہ دیا کہ آج اپنی طبیعت سے لے چلو"۔ پُشپا نے اپنے عرق آلودہ رخساروں کو ریشمی رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

ملاح کچھ دیر تک سوچتا رہا...... سُندر استھان ...... کہاں لے چلوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو۔ جہاں سرکار کو لے چلوں۔ پسند نہ آئے ...... اچھا قیدیوں کے قلعے کی طرف لے چلوں۔ بیش قیمت پتھروں کی بنی ہوئی پہاڑ کی طرح اونچی دیواریں ہیں۔ طرح طرح کے قیدی ہیں۔ وہاں راجکماری کا دل ضرور بہلے گا۔

یہی سوچ کر ملاح نے چپّو پانی میں ڈال دیئے اور سُبک رفتار کشتی چنچل ندی کے سینے پر تھرک چلی۔

ڈھلتی عمر کے باعث مانجھی ایک تو ویسے ہی کانوں سے اُونچا سُنتا تھا۔ دُوسرے ندی کے شور ــــــ چپّو کی آواز ــــــ کشتی کو کبھی کنارے سے دھارے میں لاتا ــــــ کبھی دھارے سے کنارے کی طرف۔ بُوڑھا ملاح اپنی دُھن میں کشتی بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ کبھی غیر ارادی طور پر دونوں سہیلیوں کی طرف نگاہ ڈالتا تو صرف سر کا ہلنا۔ گردن کا ترچھی ہونا اور اُنگلیوں کی حرکت ہی دیکھ سکتا تھا۔

ایک نارنگی کی دو قاشوں کی طرح دونوں سہیلیاں گھُل مِل کر باتیں کر رہی تھیں۔ راجکماری نے محبت آمیز انداز میں کہا "جیسی محبت مہاراج اور پردھان منتری جی میں ہے۔ ویسی ہی راج پُتری اور منتری پُتری میں بھی"

اس میں کیا شک ہے۔ برہما نے جوڑی ہی ایسی ملا دی ہے"

" پُشپا! پانی میں ہم دونوں کے مکھڑے ناچ رہے ہیں۔ میرا عکس کون ہے اور تمہارا کون؟ یہ تو پہچانا ہی نہیں جاتا۔"

" ہاں اندو! یاد ہے؟ اُس دن گرو ماتا نے کہا تھا جیسے بھگوان نے بھُول کر ہم دونوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا ہے"

" ارے وہ تو جانے دو۔ ابھی اُس دن ماں نے مجھے دُور سے دیکھ کر پُشپا کہہ کر پکارا تھا"

" سچ ــــــ؟"

"ہاں۔ ہاں۔ تو کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں؟"

"میری ماں نے کہا تھا کہ ہم دونوں کا جنم بھی ایک ہی ساتھ کا ہے۔ تم دن میں پیدا ہوئی تھیں۔ مَیں اسی رات میں۔"

"تو، مَیں تم سے بڑی ہُوں؟"

"واہ گھنٹوں کی بڑائی چھوٹائی کا کیا سوال؟ پھر بھی میں چھوٹی ہی ہوں۔ چاہیئے بھی یہی۔ آپ، ہر طرح بڑی ہیں۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ۔ پھُولوں میں تمہیں سب سے زیادہ کون سا پھُول پسند ہے؟" راجکماری نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"گلاب! خوشبو اور رنگ، دونوں ہی بے مثال ہیں۔"

"ارے تم میرے دل کی بات کیسے جان گئیں ———؟ گلاب ہی تو مجھے بھی سب پھُولوں میں زیادہ پسند ہے۔ عجیب بات ہے۔ ہم دونوں کی پسند بھی ایک ہی ہے۔"

"اچھا مَیں بھی ایک بات پُوچھوں ———؟ کون جانے اس میں بھی آپ کے دل کی بات میرے دل کی بات سے میل کھا جائے۔" پُشپا نے راجکماری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں سُنوں بھی۔"

"شادی کے لئے آپ کیسا شوہر پسند کریں گی؟ سانولا یا گورا؟ نازک اندام یا قوی ہیکل؟ شاعر ——— سیاست داں ——— فلسفی ——— مصوّر ——— یا بہادر سپاہی ———؟؟"

تمہیں ابھی سے شوہر کی بھی فکر پڑ گئی؟ میں نے تو یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ اچھا جس کا سوال وہی بتائیے کہ وہ کیسا شوہر چاہتی ہے ـــــ؟"
راجکماری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی لئے تو میں پوچھ نہیں رہی تھی۔ آپ اپنے دل کی بات پہلے کہیں۔"
انتخاب تو بہت مشکل ہے۔ لیکن اگر چننا ہی پڑے تو میں چاہوں گی۔ گورا تندرست، توانا۔ بہادر جودھا۔"

پشپا پیشانی پر بل ڈال کر ایک طویل سانس کھینچتی ہوئی بولی "دنیا کی دو چیزیں باہر اور اندر ـــــ ایک نہیں ہو سکتیں۔ ایشور کو کچھ نہ کچھ تفاوت رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

"پہلے اپنے دل کی بات تو بتاؤ سیانی! قدرت کی مصلحتوں پر رائے زنی بعد میں کرنا۔"

"میں ...... میں ...... تو سانولا۔ نازک اندام ـــــ شاعر ـــــ جو کسی قدر فلسفی بھی ہو۔ ایسا شوہر پسند کروں گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔" راجکماری نے سہیلی کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں ہاں سچ مچ۔"

شوہر کے انتخاب میں اس اختلافِ خیال پر راجکماری کچھ آزردہ خاطر ہوئی۔ پشپا کو وہ اپنا دل ہی سمجھتی تھی۔ اپنے ہی پیکر کا پرتو۔ اندرونی۔ بیرونی دونوں اعتبار سے۔ پھر بھی اسے اپنے اختیار سے باہر کی بات سمجھ کر اس نے پیار بھرے انداز سے پشپا سے کہا۔ "اگر ایک ایسا راج ہو۔ جہاں کا راجکمار تو میری پسند کا

اور منتری کمار تمہاری پسند کا ہو تو البتہ ہم ایک دوسرے سے جدا نہ ہو سکیں گی"
راجکماری نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسا ہو تو پھر کیا پوچھنا ہے۔"

"میرا عہد یہی رہے گا۔ ہم دونوں کی پسند کے مطابق ایک راج میں راجکمار اور منتری کمار ملیں تب تو شادی کروں گی۔ نہیں تو اسی طرح کنواری رہوں گی۔"

"اگر یہ شرط پوری نہ ہوئی تو میں بھی زندگی بھر کنواری رہوں گی لیکن شادی نہ کروں گی۔"

"تو ہو گیا آج سے عہد ——— ؟" راجکماری نے سہیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو کیا ابھی ہونا باقی ہے؟" پُشپا نے پُر استقلال انداز میں کہا۔
فرطِ محبت سے دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ اتنے میں کشتی کنارے سے جا لگی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ دونوں چونک کر الگ ہو گئیں۔ ملاح نے ندی کے کنارے کھڑے ہوئے ایک درخت سے کشتی باندھ دی۔ دونوں سہیلیاں اُتر کر ٹہلنے لگیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ندی قلعے کی دیوار سے مل کر بہتی تھی۔ اس قلعے میں صرف قیدی رہتے تھے۔ سیاہ پتھر کے اونچے ستونوں کا عکس ندی سے گزر کر اس پار تک پہنچتا تھا۔ برگد، پیپل اور املی کے بوڑھے درخت اس قلعے کے ہمجولی تھے۔ قلعے کے

اندر ہر طرح کے قیدیوں کے لئے الگ الگ جگہیں مخصوص تھیں۔ راج کے باغی ایک طرف رہتے تھے مفتوحہ راج کے قیدی ایک طرف۔

اب سے دس برس پہلے راجہ نے اپنے ایک دیرینہ حریف پر چڑھائی کی تھی۔ اُس کے کچھ شکست خوردہ سپاہی قلعے میں مقیّد تھے۔ ان میں ایک شاعر بھی تھا۔ جو سُورما سپاہیوں کی رگوں میں جوش بھرنے کے لئے اپنی شعلہ نوائی سے دلوں میں آگ بھڑکاتا ہوا لشکر کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اور اب قلعے میں اسیری کی زندگی گزار رہا تھا۔ شعلہ نوا شاعر ہونے کے باعث دوسرے قیدیوں کے مقابلے میں اُسے کچھ رعایتیں حاصل تھیں۔ اس کے پاؤں میں آہنی بیڑیوں کی بجائے طلائی بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ ندی کے کنارے سے لگا ہوا چھوٹا سا بالاخانہ تھا جس میں ہوا اور دھوپ آنے کیلئے لوہے کی مضبوط سلاخوں کا ایک دروازہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں کے درمیان میں اپنی اداس آنکھیں ڈالے ہوئے پُر شور ندی کی آزاد موجوں کی اٹکھیلیاں دیکھنا شاعر کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ کھڑے کھڑے جب اُس کے پاؤں ہلنے لگتے تو بیٹھ جاتا۔ اس کا بھرا بھرا جسم سُوکھ کر کانٹا ہو چلا تھا۔ پسلیاں ایک ایک کر کے گنی جا سکتی تھیں۔ مُونچھیں بڑھ کر ڈاڑھی سے ہمکنار ہو رہی تھیں۔ بڑھے ہُوئے ناخنوں کو اُس نے پتھر پر گھس کر چھوٹا کر لیا تھا۔ بیڑیوں کی رگڑ سے پاؤں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ نام کے لئے بیڑیاں سونے کی تھیں۔ لیکن کام آہنی ہی کا کرتی تھیں۔ آخر بیڑیاں بیڑیاں تھیں۔ شاعر کا جسم افسردہ و پژمُردہ ہو گیا تھا لیکن اُس کے دل کی تر و تازگی اور جذبات کی طوفان خیزی

میں سر مُو فرق نہ آیا تھا۔ والہانہ محبت کرنے والی حسین و نوخیز بیوی کی ایک دُھندلی سی یاد امتدادِ زمانہ کے بعد بھی اُس کے حافظے کے کسی گوشے میں دبی پڑی تھی۔ دس برس کی طویل مدت کے بعد شاعر نے ندی کے کنارے دو نوجوان عورتیں دیکھیں۔ اُس نے آنکھوں کو پوری قوت سے یقین دلایا کہ ہاں عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خوش آئند یاد کے حسین دھاگوں کو پکڑ کر شاعری کی نئی نویلی دُلہن اس کے دل کی پہنائیوں میں اُتری۔ دیر سے کھڑے کھڑے اُس کے نحیف و ناتواں پاؤں کانپنے لگے۔ وہ بیٹھ گیا سہم سا گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے دل کی رانی بھی قید خانے میں مقید ہے۔ اس کی آنکھوں میں گرم آنسوؤں کے قطرے کانپ رہے تھے۔ زبان سے بھی ایک پُر درد آواز نکل پڑی

"اے نازک اندام حسینہ! اپنی یاد سے بھی کہہ دے۔ میرے پاس نہ آئے۔ میں جس قید خانے میں قید ہوں۔ اُس کی اونچی اور مضبوط دیواریں پتھر کی ہیں!!"

راجکماری اور اس کی سہیلی لپشپا قلعہ دیکھنے کے لئے آرہی تھیں۔ اُن کے کانوں میں شاعر کی درد بھری آواز پڑی۔ لپشپا کا دل کانپ اُٹھا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا...... بیٹھے بیٹھے اُکتا کر شاعر پھر اُٹھا اور ندی کی لہروں کو دیکھنے لگا۔ اُس کی زبان پر پھر وہی شعر جاری ہو گیا۔ قیدی کو گاتے ہوئے دیکھ کر دونوں سہیلیاں اُس کے پاس آگئیں اور چُپ چاپ سُننے لگیں۔ شاعر بیک وقت دو چاند سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا ——— اور آنکھیں بند کر کے آہستہ سے نیچے بیٹھ گیا۔

"بیٹھ کیوں گئے قیدی؟ ذرا وہی گانا پھر گاؤ۔" پُشپا نے دروازے کی سُلاخوں کو پکڑ کر کہا۔

شاعر کے دل میں دھڑکن تھی۔ گلا خُشک ہو گیا تھا۔ وہ جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ پُشپا نے سوچا۔ شاید قیدی بہرا ہے۔ اس لئے اُس نے بلند آواز سے کہا: "قیدی ذرا پھر وہی گانا گاؤ۔"

"گلا خُشک ہو گیا ہے۔ ذرا ٹھہر کر گاؤں گا۔"

اندو نے پُشپا کے کان میں کہا: "راج دربار میں بڑے بڑے ماہر فن اُستادوں کے گانے سُنتے سُنتے کان پک گئے۔ اب قیدی کا رونا سُننا باقی رہ گیا ہے۔"

"اس میں خرچ ہی کیا ہوتا ہے۔ اسے بھی سُن لیں کیسی درد بھری آواز ہے۔" پُشپا نے لجاجت سے کہا۔

اتنے میں قیدی اُٹھا اور پھر گانے لگا ——————

"اے نازک اندام حسینہ! اپنی یاد سے بھی کہہ دے۔ میرے پاس نہ آئے۔ مَیں جس قید خانے میں اسیر ہوں۔ اُس کی اُونچی اور مضبوط دیواریں پتھر کی ہیں!!"

پُشپا کا نرم و نازک نسوانی دل تڑپ اُٹھا۔ اُس نے راج کماری سے کہا "کیسا نازک تخیّل ہے۔ قیدی جیل میں ہے —————— اور اپنی نازک اندام محبوبہ کی یاد سے بھی کہہ رہا ہے کہ مَیں پتھر کی اُونچی اور مضبوط دیواروں میں مقید ہوں۔ میرے پاس نہ آئے۔ ورنہ اُسے تکلیف ہو گی۔

سچ مچ بے حد حسین تخیّل ہے۔ راجکماری نے صرف ٹالنے کے لئے کہہ دیا۔

شاعر کے دِل میں حیرت و استعجاب کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اُس کے سامنے دو حسین

پر بیک وقت دو چاند اپنی جمیل کرنیں بکھیر رہے تھے۔ اُس نے ہاتھ باندھ کر مسکین آواز سے پُوچھا "کیا آپ راج گھرانے کی دیویاں ہیں ——؟"

"ہاں ......" راجکماری نے کہا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے۔ آپ جُڑواں بہنیں ہیں۔ ایک چاند کے دو ٹکڑے —— ایک تصویر کے دو عکس —— ایک ہی ساز کی دو آوازیں —— ایک ہی گلاب کی دو پنکھڑیاں ......"

"قیدی! تم تو شاعری کرنے لگے۔ اچھا تخیل اور تشبیہہ کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی طرف آؤ۔ تم شاعر ہو۔ بتاؤ ہم دونوں میں زیادہ حسین کون ہے ——؟" راجکماری نے پُشپا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

شاعر نے کچھ سوچ کر کہا "آپ دونوں حسن کی دیوی اور رُوپ کی رانی ہیں۔ ایک آفتاب تو دُوسری ماہتاب —— ایک ہی گلاب کی دو پنکھڑیاں —— دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مجھے عورت کو دیکھے ہوئے دس برس ہو گئے۔ حُسن کو پرکھنے کی صلاحیت کچھ ماند پڑ گئی ہے۔ اس لئے صحیح رائے زنی کرنے سے معذور ہوں۔ اور پھر یہ کوئی ضروری نہیں کہ میری رائے دُرست ہو۔ اپنی اپنی نظر۔ اپنا اپنا خیال ہے۔"

راجکماری نے مُسکراتے ہوئے پھر پُوچھا۔ "ہم دونوں کے رُوپ کو ایک برابر کا تو سب ہی کہتے ہیں لیکن تم تو شاعر ہو۔ بار یک بیں ہو، مان لو دونوں میں سے ایک کو تمہیں پیار کرنا ہو تو کسے چاہو گے ——؟ اپنے ہی نقطۂ نظر سے بتاؤ۔"

شاعر نے دونوں دوشیزاؤں کی طرف ایک بار آنکھ اُٹھا کر دیکھا پھر راجکماری

سے کہا "اگر آپ مجھے اظہارِ خیال کے لئے مجبور ہی کر رہی ہیں۔ تو سُنیئے آتے ہی آتے انہوں نے میرے دل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سب کچھ ایک ہوتے ہوئے بھی ان کی آنکھیں چنچل ہرنی کی آنکھوں کی طرح کشش انگیز ہیں۔ جو اپنی طرف ہر دیکھنے والے کو زبان بے زبانی سے دیکھنے کی خاموش دعوت دیتی ہیں ——

آپ کی آنکھیں گول۔ بڑی اور معصوم ہیں۔ اُن کی آنکھیں آنکھوں کا شاہکار ہیں۔ آپ کی معمولی۔ مجھے تو آپ سے زیادہ حسین وہی معلوم ہوتی ہیں۔ اُمید ہے کہ اس صاف گوئی کے لئے آپ مجھے معاف فرمائیں گی"

قیدی کے ان الفاظ نے راجکماری کے دِل پر نشتر کا کام کیا۔ اُس نے یوں ہی دل بہلانے کے لئے قیدی سے اپنے حُسن کا موازنہ کرنے کے لئے کہا۔ لیکن اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کے جواب سے اُس کے نازک دِل کو اتنی ٹھیس لگے گی۔ اُسے شاعر پر بہت غصّہ آیا۔ اُس سے ہمدردی کے بجائے نفرت ہو گئی۔ ان تمام جذبات کو دبانے کے باوجود اُس کے پھُول سے رُخساروں کی سُرخی میں اضافہ ہو ہی گیا۔ اس کا حسین مکھڑا غصّے سے تمتما اُٹھا۔ تپسیا کی حیثیت اور اپنی ہار پر راجکماری بھُوکی شیرنی کی طرح بپھر گئی —— خراماں خراماں دونوں کشتی پر آکر بیٹھ گئیں۔

کانپتے ہوئے سُرخ آفتاب کو شام کی پری نے اپنے آنچل میں چھُپا لیا تھا۔ پھر بھی دامنِ اُفق سے ڈوبتی ہوئی کرنوں کی سُرخی چھَن چھَن کر آ رہی تھی۔ چنچل لہریں قلعے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

ملاح نے کشتی کھولی اور چپّو پانی میں ڈال دیئے۔ ہلکی ناؤ ناگن کی طرح ندی

کے سینے پر دوڑنے لگی۔ دونوں سہیلیاں خاموش بیٹھی تھیں۔ پُشپا اگر کوئی بات شروع کرتی تو جواب میں راجکماری خاموش ہی رہتی یا کبھی بے دلی سے ہاں یا نا کہہ دیتی۔

بھولی پُشپا راجکماری کے گہرے دل کی تھاہ نہ پا سکی سمجھتی تھی کہ سفر کی تکان اور فضا کی ناسازگاری سے طبیعت کچھ بھاری ہو گئی ہو گی۔

کشتی گھاٹ پر لگی۔ دونوں آہستہ سے اُتریں۔

——— ہمیشہ ان کا معمول تھا کہ سیر سے واپس آ کر دونوں ساتھ ہی راج محل میں آتی تھیں۔ پھر پُشپا اپنے گھر جاتی۔ آج پُشپا سے رخصت ہو کر راجکماری تنہا آئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلے پھر خواب گاہ میں جا کر بے سدھ سی پلنگ پر گر پڑی۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی ...... دونوں حُسن کی دیوی اور روپ کی رانی ہیں۔ ایک آفتاب تو دُوسری ماہتاب ہے۔ ایک ہی گلاب کی دو پنکھڑیاں ہیں...... ایک ہی تصویر کے دو عکس ...... لیکن آنکھیں چنچل ہرنی کی طرح ...... سیدھی سی بات کے لئے دُنیا کتنے انداز اختیار کرتی ہے۔ کہاں راجکماری اور کہاں منتری کی بیٹی ...... کہاں مالک کا سارا راج کہاں نوکر کی صرف تنخواہ ...... کہاں وہ۔ کہاں میں ...... تل اور پہاڑ کا فرق! وہ بدنصیب قیدی بھی کتنا بدبخت ہے ...... نرک کا کیڑا۔ ہر نے دو اسے قید میں۔ محبوبہ کی یاد آتی ہے ...... محبوبہ کی نرم و نازک گوری کلائیوں کے بدلے انہیں سخت بیڑیوں کو چومے ......

راجکماری کے دل پر سخت ٹھیس لگی تھی۔ وہ جُوں جُوں سوچتی جاتی تھی۔ رقابت و رشک آہستہ آہستہ جذبۂ انتقام میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔

راجکماری اپنے بڑے راجہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں کی آنکھوں کا نور اور باپ کے دل کا سرور تھی۔ راج محل ہی نہیں، سارا راج اس کی جوت سے جگمگا رہا تھا۔ بیٹی کی آہٹ نہ ملنے پر ممتا کی ماری ماں دوڑی ہوئی بیٹی کے کمرے میں آئی۔ راجہ بھی رانی کے ساتھ ہی آیا۔ دونوں نے بے سُدھ پڑی ہوئی راجکماری کو جگایا۔ اُس نے کروٹ لی۔ ماں نے پوچھا ——— "کیا ہو گیا بیٹی؟ ابھی تو گھوم کر آئی ہے"۔

"دل میں درد ہو رہا ہے۔ قیدیوں کے قلعے کی طرف گئی تھی۔ بھوت کی طرح خوفناک قیدی شاعر نے گھور کر مجھے ——— ڈرا دیا۔ اور مُنہ لگی لپٹ چلانے میری توہین کی ......"

"اوہ، تپشیا کی مجال کیا کہ میری گلاب کی کلی کو کچھ کہے۔ دربار کی ہوا لگ گئی۔ مزاج آسمان پر چڑھ گیا۔ اندوہی نے اپنے ساتھ گھما گھما کر اُسے سر چڑھایا ہے۔ ذلیل منتری کی بیٹی۔ راجکماری کے برابر بیٹھنا چاہتی ہے اور وہ بدبخت قیدی کل پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔" رانی نے غصّے سے بے قابو ہو کر ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

ماں کا سہارا پاکر راجکماری کراہتی ہوئی بولی "ابھی مجھ سے خواب میں کوئی کہہ رہا تھا۔ دل کا یہ زخم جبھی بھرے گا جب منتری راج سے نکال دیا جائے اور قیدی شاعر پھانسی پر چڑھا دیا جائے"۔

راجکماری کی دُکھ بھری باتیں سُن کر رانی کے دل میں ایک طرف تو بیٹی کی محبت موجزن ہوئی۔ دوسری طرف منتری کے خلاف غم و غصّہ کی آگ بھڑکی۔

راجہ کھڑا ہی تھا۔ رانی نے آندھی کی طرح دوڑ کر ایک مقرب خاص کو حکم دیا کہ اسی وقت مُنادی کرادی جائے۔ کہ کل سورج نکلنے سے پہلے راج منتری راج سے نکال دیا جائے گا۔ اور قیدی شاعر کو پھانسی دے دی جائے گی۔

رانی کے اصرار پر راجہ کو بھی اُس کی رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑا۔ دُوسرے دن صبح ہوتے ہوتے یہ حسرت خیز و الم انگیز خبر راج کے کونے کونے میں گونج گئی۔

(جوگندر ناتھ شرما کی ہندی کہانی سے)
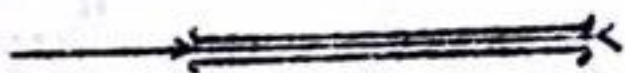
شکستِ پندار

چٹ پٹ کرتی، اپنے چپل بجاتی، جب وہ کمار کے کمرے کے سامنے سے گزرتی تو اُس کی نگاہیں بے اختیار اُس کی طرف اُٹھ جاتیں، کتابیں یُونہی کھُلی کی کھُلی میز پر پڑی رہتیں۔ اُس کے جانے کے بعد وہ پڑھتا ——— گھنٹوں پڑھتا لیکن یاد کچھ نہ ہوتا، سمجھ ہی میں نہ آتا، سارے حرُوف جیسے لپٹے سے معلوم ہوتے، کمار جھنجھلا کر کتابیں دُور پٹک دیتا اور کرسی پر سر لٹکا کر کمرے کی چھت کی طرف دیکھتا ہوا سوچتا ——— یہ رتن کیسی ہو گئی ہے؟ میرے کمرے کے سامنے سے خاص کر جب پڑھتا رہتا ہوں۔ کیوں گزرتی ہے؟ ——— کمار

اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی ڈھونڈ لیتا اور نہ جانے کیوں اپنے آپ ہی ہنس پڑتا۔

کمار اپنے خاندان کے سارے بچوں کا "دادا" تھا یعنی سارے لڑکوں سے بڑا تھا۔ کوئی اسے چچا کہتا اور کوئی دادا، جب وہ پڑھتا ہوتا اور کوئی بچہ کمرے کے پاس آتا تو وہ اپنی خشمگیں آنکھیں اس کی طرف صرف اُٹھا دیتا۔ سب بچے ڈر کر بھاگ جاتے، جب گھر میں زیادہ شور و غل ہوتا تو وہ کمرے ہی سے چیختا ——— "بند کرو اس شور کو، نہیں تو میں ہوسٹل میں جاکر رہنے لگوں گا" بے چاری رادھا جلدی سے بچوں کو چُپ کرا دیتی۔ ناشتے کے وقت رادھا کے سوا اُسے کوئی بُلانے نہ جاتا۔ وہ دروازے ہی پر سے پُوچھتی ——— "بھیا، ناشتہ بھیجوں ———؟"

کمار سر جھکائے ہوئے کہہ دیتا ——— "ابھی نہیں، ایک گھنٹہ پڑھ لوں گا تو کچھ کھاؤں گا" بیچاری رادھا لوٹ جاتی، لیکن جب رتنا اندر سے چپٹ پٹ کرتی نکلتی تو اُس کی نگاہیں اُٹھے بغیر نہ رہتیں۔ رتنا بھی جاتے جاتے اُس کی طرف مُسکرا کر دیکھ لیتی۔ جیسے وہ کہتی ——— "اِن آنکھوں سے تم مجھے نہیں ڈرا سکتے" کمار کا سر جھک جاتا۔

رتنا روز اس کی بہن سروج کے پاس آتی گھنٹوں بیٹھتی اور روز ہی کمار اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا لیکن رتنا کے سامنے جاتے ہی اُس کی پُر معنی مُسکراہٹ کو دیکھ کر خاموش رہ جاتا۔ کیا کہے۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا، رتنا کے بجائے سروج سے نہ جانے کہاں کی بے سر و پا باتیں کہتا جاتا۔ رتنا مُنہ پونچھنے کے حیلے سے اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش کرتی یا کھانس کر ہنسی روکتی۔ اُس وقت کمار کو وہاں ایک لمحہ بھی کھڑا ہونا دوبھر ہو جاتا، وہ سوچتا ———

چار برس پہلے تو ایسا نہ ہوتا تھا ۔ بچپن ہی سے رتنا کو دیکھتا آرہا ہوں ۔ درمیان میں جب اُس کے بابو جی کا تبادلہ الہ آباد سے آگرہ ہو گیا ، اسی وقت سے ان دونوں کے درمیان شرم و حجاب کی دیوار آکھڑی ہوئی ہے ۔ چار مہینے ہونے کو آرہے ہیں ۔ وہ پھر الہ آباد آگئی ہے ، اپنے اسی پرانے مکان میں ، لیکن جب کی رتنا اور اب کی رتنا میں بہت فرق ہو گیا ہے ۔ پھر وہ کیسے بولے ـــــــ ؟

کمار صبح سے پڑھنے بیٹھتا اور نو بجنے پر اُٹھتا ۔ نہا دھو کر کوئی اچھا سا سوٹ پہنتا ، دو چار کتابیں لے کر سائیکل پر کالج چلا جاتا ۔ وہ سیکنڈ ائیر میں پڑھتا تھا ۔ اُدھر ٹھیک وقت پر گرلز ہائی سکول کی گاڑی بھی رتنا اور سروج کو لینے کے لئے آتی ۔ دونوں اپنی اپنی کتابیں بغل میں دبا مکھن کی طرح ڈھلی ہوئی چوڑے کنارے کی دھوتی اور سرخ نیلے بلاؤز پہن کر فیروزی رنگ کے چمکتے ہوئے ربن چوٹی میں باندھ کر مسکراتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھتیں ، دونوں آٹھویں درجے میں پڑھتی تھیں ۔ راستے میں لڑکیاں گاڑی کا پردہ اُلٹ دیتیں ۔ گاڑی کے پیچھے کتابیں دبائے پانچ چھ لڑکے آوازے کستے ، پریم کا راگ الاپتے ، آپس میں ہنسی مذاق کرتے آہستہ آہستہ چلتے تو رتنا کو بہت بُرا لگتا ، وہ سوچتی ۔ یہ لڑکے کتنے بے حیا اور بے غیرت ہیں ، لیکن کمار ـــــــ ؟ کتنا شرمیلا ، سیدھا سادہ بچہ ہے ـــــــ

اور کیا ، بچہ تو ہے ہی ، جیسے بولنا تک نہیں آتا ۔ کمار کی بات سوچ کر اُس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ۔ اُسی وقت کوئی لڑکی پیچھے سے کچھ کہہ اُٹھتی ۔ رتنا کی بھویں ایک دم کمان سی کھنچ جاتیں ، سروج اُس کے یہ انداز دیکھ کر ہنسنے لگتی ، رتنا آنکھوں سے آنکھیں ملا کر پوچھتی ـــــــ "کیوں ، اس میں کیا ہے ہنسنے

کی کیا بات ہے ؟"

ساتھ ہی لڑکیاں بول اُٹھتیں ــــــ "سروج ! بیچاری کو کیوں تنگ کرتی ہو ؟ وہ شرماتی ہے ابھی۔ ہاں رتنا ! تم گھونگھٹ نکال کر بیٹھو" اور پھر اسی نقرئی قہقہوں کی گونج سے گاڑی گونج اٹھتی۔

سروج کی ہندی کمزور تھی۔ آج مسز شکلا نے اسے وہ ڈانٹ بتائی کہ سروج دل ہی دل میں رونے کو آگئی۔ گاڑی میں آتے ہی بولی "دادا تو پڑھائیں گے نہیں، مجھے آج ہی ہندی کے لئے کوئی ٹیوٹر رکھنا پڑے گا۔"

رتنا بولی "کیوں ؟ کمار کی ہندی تو بہت اچھی ہے۔"

"اچھی ہے تو مجھے کیا ؟ جب کمرے میں جاؤ، پڑھنے سے فرصت ہی نہیں۔ رما یا اروند کوئی گیا نہیں کہ بس برس پڑے۔ ایسے کس کے بھائی ہوتے ہیں" سروج نے منہ پھلا کر کہا۔

رتنا نے گاڑی پر چڑھتے ہوئے کہا۔ "اچھا آج میں کہوں گی چل کر۔"

اور سچ مچ ہی کھانا کر ہندی کی کتاب لی۔ اور رتنا کمار کے کمرے میں جا پہنچی۔ کمار کی پُرشوق نگاہیں اس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے مل گئیں۔ رتنا شرما گئی۔ جلدی سے دوسری طرف دیکھ کر بولی "کمار ہمیں اور سروج کو ہندی کیلئے دس پندرہ منٹ دے سکو گے ــــــ ؟"

کمار شرم سے پانی پانی ہو گیا کیسے جواب دیتا ؟ ہکلا کر بولا "تو ــــ تو، تمہیں کیا پوچھنا ہے ــــــ ؟"

رتنا نے مُسکرا کہا ــــــ "پُوچھنا نہیں، پڑھنا ہے، روز دس پندرہ منٹ، کیا پڑھا سکیں گے ــــــ؟"

کسی طرح کمار بولا "لیکن مجھے تو پڑھانا آتا نہیں"۔

سروج دروازے پر پردے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ پردہ ہٹا کر بولی "میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ دادا کو کہاں اتنی فرصت؟ آؤ رتن آج ہی بابوجی سے کہہ کر ٹیوٹر رکھوا دوں گی"۔

کمار کا ایسا خشک جواب سُن کر رتنا کا منہ ایک دم اُتر گیا۔ کانپتے پاؤں سے آہستہ آہستہ کمرے سے نکل آئی۔ اُس دن کے بعد وہ پھر کبھی کمار کے پاس سے ہو کر نہیں گزری۔ جب کمار سروج کے کمرے میں جاتا تو رتنا کسی نہ کسی حیلے سے باہر نکل جاتی ــــــ کمار خاموش کھڑا کھڑا دیکھتا رہ جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ رتنا اس سے ناراض ہو گئی ہے۔ وہ اُسے منانا چاہتا تھا لیکن کیسے منائے یہ پہیلی کمار کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

سروج کو پڑھانے کے لئے دُوسرے ہی دن کمار نے اپنے ایک دوست کو کہہ دیا۔ رتنا بھی اُسی سے پڑھنے لگی۔ کمار کتاب کھول کر بیٹھتا تو اُسے حروف کے بجائے رتنا کی اُداس صورت نظر آتی۔ وہ کچھ دیر کے بعد اکتا کر کتاب بند کر کے ٹہلنے نکل جاتا۔ رتنا کو سروج کے کمرے میں دیکھ کر وہاں جا پہنچتا اور کہتا "سروج! پینے کے لئے ذرا پانی تو لاؤ"۔ سروج کے جانے سے پہلے رتنا دوسرے دروازے سے نکل بھاگتی۔ سروج جب پانی لاتی تو اُسے کھویا کھویا سا پاتی کمار چونک کر پانی لیتا، ایک دو گھونٹ پی کر گلاس سروج کو دے دیتا اور باہر نکل جاتا۔

سروج نے اُس دن کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اُسے کچھ اتنا بُرا بھی نہ لگا۔ وہ کملا کی عادت سے تو واقف ہی تھی۔ لیکن رتنا اُس سے ناراض تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب دادا نے اُسے پڑھانے کے لئے اپنے ایک دوست ہی کو لگا دیا ہے اور رتنا بھی یہ جانتی ہے تو پھر اُس سے کیوں اتنی کھنچی رہتی ہے کہ اس کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتی؟ اُس کے سامنے سے گذرتی تک نہیں۔

سکول میں کملا، رتنا اور سروج کے ساتھ ہی پڑھتی تھی، رتنا کو اُس سے بے حد اُنس تھا۔ دونوں چھٹی کے وقت ہاتھ میں ہاتھ دیئے چاروں طرف احاطے میں گھومتی پھرتیں، جانے کہاں کہاں کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ اُسی سے کملا کی شادی طے ہو گئی۔ رتنا کو الگ لے جا کر سروج نے اُسے بتایا کہ اگلی گرمیوں میں کملا سے دادا کی شادی ہو گی، آج سے کملا کو بھابی کہہ کر چڑانا۔"

رتنا کے دل میں جیسے کسی نے چھری گھونپ دی۔ ایک پھیکی ہنسی ہنس کر اُس نے کہا "کیوں نہیں ......"

اس کی بُرا ندوہ ہنسی دیکھ کر سروج رتنا کا مُنہ دیکھتی رہ گئی۔ اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، اس نے کونسی ایسی بات کہہ دی جو رتنا کو اتنی بُری لگی! کچھ ٹھہر کر سروج نے کہا "کیوں کملا تو سکول کی ساری لڑکیوں سے حسین ہے۔ پھر کیوں ......؟"

رتنا اب تک سنبھل چکی تھی۔ اُس نے سنجیدہ انداز سے کہا "ارے تو میں نے

کیا کہا؟ میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اسی لئے تو مجھے ہنسی آگئی کہ کہاں تو میرے سر میں درد ہو رہا ہے، اور کہاں تمہیں شادی بیاہ کی پڑی ہے۔ اچھا تو ہے دعوت کھانے میں بھی آؤں گی۔"

سروج نے اُس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا "میں کیا جانتی تھی کہ تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے، لاؤ میں دبا دوں۔"

رتنا نے اپنا رومال سروج کو دے کر کہا "اسے کس کر باندھ دو۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ سروج" اور وہ دھم سے وہیں بیٹھ گئی۔ کملا نے دور سے پکارا! "رتنا، ارے تم وہاں بیٹھی ہو، میں جانے کہاں کہاں ڈھونڈتی پھری۔"

رتنا کو نہ جانے کیوں کملا پر غصہ آ رہا تھا، وہ کچھ نہ بولی، گم سم سی بیٹھی رہی، سروج نے جو رومال باندھا تھا۔ اُسے کھول ڈالا۔

سروج نے کملا سے کہا۔ "ارے بھابی، دیکھو تو رتنا کو۔"

کملا نے شرما کر کہا۔ "ہش، ساری لڑکیاں سنیں گی تو کیا کہیں گی؟ سروج تم بہت شریر ہو۔"

سروج اپنا سر ہلا کر کہنے لگی"۔ بڑی آئی کہیں کی شرمیلی! دل تو چاہتا ہوگا ......"

کملا نے مسکراتے ہوئے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

رتنا درخت سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی، بات کا رُخ بدلنے کے خیال سے کملا پاس کی لڑکی سے بولی "دیکھو تو رتنا کو سانپ سونگھ گیا ہے!"

لڑکیاں ہنستی مسکراتی ہوئی آئیں، ایک بولی ——— "نہیں جی آج اُس

گھونگھریالے بالوں والے لڑکے نے اسے نظر مار دی ہے۔" ساری لڑکیاں بے اختیار ہنس پڑیں۔

رتنا کو اس وقت یہ باتیں اور بھی بُری لگیں۔ اُس نے غصّے سے تمتما کر کہا "تم سب کتنی شیطان ہو ـــــــ؟"

کملا نے لڑکیوں کو گِن کر کہا "بیس ـــــــ!!" اور سب کی سب پھر ہنسنے لگیں۔

سروج نے کہا "چُپ چُپ، مس بینرجی آ رہی ہیں۔"

مس بینرجی ساتویں آٹھویں کلاس کو پڑھاتی تھیں، بہت ہی زندہ دل تھیں، اُن کے سامنے کلاس میں لڑکیاں ایسی ایسی باتیں کرتیں کہ ڈانٹنے کی بجائے مس بینرجی اُن کی پیٹھ ٹھونک کر اُن کی مزید حوصلہ افزائی کرتیں، دُوسری اُستانیاں انہیں بناتیں ـــــــ "آپ بھی ابھی بچّی بنی ہیں" ـ کوئی کہتی ـ "ابھی تو دُودھ کے دانت بھی نہیں گرے۔"

وہ آتے ہی بولیں۔ "یہ خاموشی کیوں چھا رہی ہے لڑکیو! آج تم سب کا گانا ہوگا۔"

سروج کے ساتھ ہی ساری لڑکیاں بول اُٹھیں "ہم لوگوں کا بعد میں، پہلے آپ کا گانا ہوگا۔"

رنگین مزاج مس بینرجی کرسی پر بیٹھ گئیں، باقی سب لڑکیاں گھاس پر پھسک کر بیٹھیں، اُنہوں نے گانا شروع کیا ـــــــ

نیلدی پیت کی ریت

دیکھی نیاری پیت کی ریت

پریم جگت کے پھول شول ہیں

بیری شتر و میت

دیکھی نیاری پیت کی ریت

پریم کا ہنسنا رونا ہے

اور نین ہیں پیت کے گیت

دیکھی نیاری پیت کی ریت

ساری لڑکیاں ایک ساتھ ہی بول اُٹھیں "ونس مور! ونس مور!" لیکن رتنا آنکھ پھاڑ کر اُن کے منہ کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُسی وقت ٹن ٹن کر کے گھنٹہ بج اُٹھا۔ مس بنرجی نے کہا "اب کل رہا۔ آج تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ پیریڈ کس قدر جلد گزر گیا۔"

رتنا آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی ——————

پریم جگت کے پھول شول ہیں بیری شتر و میت..... !

گھر میں آتے ہی رتنا دروازہ بند کر کے بستر پر جا گری۔ خوب روئی، خوب روئی، کچھ کھایا نہ پیا۔ ماں نے پوچھا بھی تو کہہ دیا "میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے، میں مر جاؤں گی۔"

اُس روز ماسٹر آئے، پڑھنے کے لئے بلایا، لیکن رتنا نہ گئی، پھر شام کو نہ جانے کیا سوچ کر چلی آئی۔ کمار کمرے میں آیا تو رتنا اُس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔ وہ رتنا کے دل میں چھپے ہوئے درد کو نہ سمجھ سکا۔

سروج نے کہا۔

"دادا! کوئی بام ہو تو دے دو، آج رتنا کے سر میں بہت درد ہے۔"

کمار نے کہا۔ "میرے کمرے میں دیکھو میز پر امرت بام رکھا ہے اُسے اُٹھا لاؤ۔"

سروج چلی گئی تو کمار نے محبوب نگاہوں سے رتنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——— "مجھ سے کیوں ناراض ہو رتنا ——— ؟"

رتنا نے اپنی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں، آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اُس نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔

"کمار ...."

کمار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رتنا اپنے اُمنڈتے ہوئے جذبات کو روک نہ سکی۔ اس کے قدموں پر گرتی ہوئی بولی۔

"مجھے تم مار ڈالو کمار ...."

کمار نے اُسے پاؤں سے اُٹھا کر کہا۔

"دیکھو! میری طرف دیکھو رتنا۔ اگر تم اسی طرح روؤ گی تو میں بھی جان دے دوں گا۔ میں اس طرح کیسے جی سکوں گا رتنا ...... ؟"

دُوسرے ہی دن کمار نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا ——— "میں شادی رتنا ہی سے کروں گا ———!!"

جب سروج رتنا سے ملی تو رتنا اُس کی طرف دیکھ نہ سکی۔ سروج نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر تم دونوں میں یہ مصالحت کیسے ہو گئی؟ دادا کس طرح بدل گئے؟ مجھے

تو بڑی حیرت ہو رہی ہے۔ تم تو کبھی نہ بولی ہو نگی۔ پھر دادا ہی کی تو غلطی تھی جو....."

رتنا نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "نہیں سروج، تمہارے دادا بے قصور تھے غلطی میری ہی تھی"۔

سروج نے ہنس کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور کہا ــــــــــ

"ایک بار پھر ــــــــــ ایک بار پھر کہو بھابی کہ تمہارے دادا بے قصور تھے ــــ!

اس بار رتنا بھی ہنس پڑی ــــــــــ
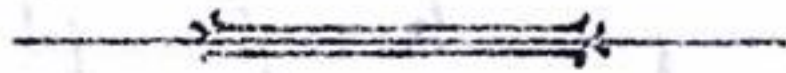
من کی نیّا ڈگ مگ ڈولے

نومبر کا مہینہ تھا، سسرال جانا ضروری تھا، شادی تھی، وہ بھی کس کی ـــ؟ خاص میری سالی کی۔ میری "وہ" بھی دو مہینے پہلے ہی جا چکی تھیں، اُنہیں بھی لانا تھا۔ غرض بیک کرشمہ دو کار کا معاملہ تھا۔

رات کی میل سے روانہ ہو کر دُوسرے دن صبح چائے کے وقت تک سسرال پہنچ گیا۔ میری دو سالیاں تھیں۔ ایک کا نام اندلا اور دُوسری کا لاجونتی تھا۔ اس سال لاجونتی انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے والی تھی، شادی بھی اُسی کی تھی۔ عُمر میں میری "اُن" سے دو سال چھوٹی تھی لیکن قد و قامت میں اُن سے کسی طرح کم نہ تھی۔ بھرا بھرا

جسم ——— گداز بانہیں ——— مدماتی مُسکراتی آنکھیں ——— !

اس کی چھوٹی بہن اندرا ابھی چھوٹی تھی۔ اور نویں درجے میں پڑھتی تھی، وہ ابھی پندرھویں سال میں لگی تھی۔ تِتلی کی طرح چنچل، گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک ——— اور اُٹھتی جوانی کی طرح اُلھڑ تھی ——— ان کے چھوٹے بڑے کئی بھائی تھے۔ غرض خاصہ کُنبہ تھا۔ میرے پہنچتے ہی سب نے منٹوں میں میرے آنے کی خبر گھر بھر میں براڈکاسٹ کر دی۔

"جیجا آ گئے ——— جیجا آ گئے ——— !! بنارس والے جیجا جی....."

کا ایک شور سارے گھر میں برپا ہو گیا۔ میری مُشتاق نگاہوں نے دیکھا۔ میری چھوٹی سالی صاحبہ پردے کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔ میں نے آواز دی۔

" اندو سُنو تو، تم ابھی سے لگیں مجھ سے شرمانے؟ ارے ابھی تو تمہاری شادی بھی نہیں ہُوئی "۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر بڑوں کی نگاہیں بچاتے ہوئے چُٹکی لی۔ میں اپنی شادی کی وہ رات اب تک نہیں بھولا۔ اور شاید زندگی بھر نہ بھولوں گا جب اس شوخ و شریر لڑکی نے اپنی ہمجولیوں کی ایک حسین ٹولی سے محاصرہ کر کے میرا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

میرے فقرہ کسنے سے اندو شرما تو گئی، لیکن اُس نے جھینپ مٹانے کے لئے ہنستے ہوئے کہا۔ "نمستے!"

اُس کی ٹھوڑی اُوپر اُٹھاتے ہوئے مَیں نے مسکرا کر پوچھا۔ "کہو اندو اچھی تو ہو ——— ؟"

وہ حسین تیتری اپنی شوخ آنکھوں کو نچا کر بولی ———

"چلیئے اندر آپ کو بڑی جی جی بُلا رہی ہیں۔"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

مَیں لاجونتی کی شادی میں اُس کے پہننے کے لئے ایک ریشمیں شلوار، ریشم کی ایک باریک قمیص، زری کی مخملی صدری، ہلکی فیروزی رنگ کی باریک جھلمل اوڑھنی اور ماتھے پر لگانے کے لئے بنارس کی مشہور چمکتی ہوئی زرد رنگ کی ٹکلیاں لے گیا تھا۔ سوغات دیکھ کر لاجونتی تو بے اختیار مسکرانے لگی لیکن "وہ" خوش ہونے کے بجائے اُلٹا مجھے ڈانٹنے لگیں ــــــــ

"بیٹھے بیٹھے آپ کو یہی سب خرافات سوجھتی ہے۔ بھلا یہ سب لاجونتی پہنے گی ــــــــ؟"

فوراً بات کاٹ کر صفائی پیش کرتے ہوئے مَیں نے کہا "پہننے میں ہرج ہی کیا ہے؟ جب تم جاپانا سلک کا سُوٹ پہن سکتی ہو، تو پھر لاجونتی ذرا شلوار ہی پہن لے گی تو کون سا گناہ کرے گی ــــــــ؟ اور زیادہ ہرج سمجھو تو اس کے لئے اِس کے "اُن" سے خاص طور پر اجازت دلوا دُوں، اگر "اُن" کی طبیعت میں نام کے لئے بھی رنگینی ہو گی تو وہ اعتراض نہ کریں گے۔"

سُوٹ کی بات سُن کر اُنہیں تو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ اُنہوں نے تو ایک دم چُپ سادھ لی۔ اِدھر اپنے "اُن" کے نام سے لاجونتی الگ شرما گئی، اندرہی ایک بچی تھی، جو ہنسنے لگی۔ اُس نے میری شریمتی جی پر فقرہ چست ہی تو کر دیا "بھیجی! تم نے یہاں تو کبھی سُوٹ نہیں پہنا، ایک دن پہنو تو دیکھوں تم کوٹ پتلون میں کیسی لگتی ہو ــــــــ؟"

اندو کی بات سُن کر لاجونتی شاید سوچنے لگی "میں شلوار، قمیص اور اوڑھنی میں اُن کے سامنے کیسی کھِلوں گی ....؟"

میں نے اندو سے کہا "ہنستی کیا ہو؟ دوسرے سال تمہاری ہی شادی کا نمبر ہوگا ...... تمہارے لیئے تو میں نے سوچ رکھا ہے۔ تنزیب کا نرم و نازک کرتہ، چوڑی دار پاجامہ اور اُس پر کامدار جیسے پوری جوڑا ......"

اندو میرے فقرے پر شرماکر تکیے بنیتوں کے بان بھینکتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا "دیکھو لاجونتی، میں بڑے حوصلے سے یہ کپڑے لایا ہوں، رخصتی کے روز انہیں ضرور پہننا ہوگا، تمہیں میری قسم!"

لاجونتی نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے تو کوئی عذر نہیں، لیکن ایک شرط ہے، جیجی کو کوٹ پہنا دیجیے اور آپ چوڑے کنارے کی زنانی ساری اور بلاؤز پہنئے ــــ بولیئے منظور ہے ــــ؟"

اتنے میں اندو نیارسی ٹکلی نکال کر ہنستی ہوئی میرے ماتھے پر لگانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی "جیجاجی، دیکھیئے یہ ٹکلی آپ کے رُوپ کو دوبالا کر دیگی، جو دیکھے گا۔ وہی ریجھ جائیگا۔ اگر یقین نہ ہو تو آئینے میں دیکھ لیجیئے۔"

کس کی قسمت جسے اندو کے حسین ہاتھ ٹکلی لگائیں، بھلا میں کس دل سے اسے منع کر سکتا تھا؟ اُس کے لیئے تو سب کچھ معاف تھا۔ میں نے اس رُوپ کی مورتی کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیا اور مسکراتا ہوا بولا "تمہارے ہوتے آئینے کی کیا ضرورت ہے ــــ؟ تم کسی آئینے سے کم ہو؟"

میرے جملے پر اندو شرما تو گئی، لیکن اس نے ٹکلی میرے ماتھے پر لگا

ہی دی۔

* * * * *

شادی میں بڑا ہنگامہ تھا۔ بہت ہی دھوم دھام اور خوب چہل پہل تھی۔ کچھ بدانتظامی بھی تھی لیکن مجھے تو کچھ کرنا دھرنا تھا نہیں۔ میں تو داماد تھا۔ ہاں نوشاہ سے دو دو باتیں ضرور ہوئیں۔ حضرت شرماحضوری میں کھلے نہیں لیکن میں بھانپ گیا کہ آدمی رنگین طبع ہیں۔ مزاج میں ابھی قدرے لڑکپن تھا۔ حال ہی میں یونیورسٹی سے نکلے تھے، گھر سے خوشحال تھے۔ کوئی فکر اور پروا نہ تھی۔

شادی ہوئی لیکن رخصتی نہ ہوئی، لاجونتی کو مارچ میں سالانہ امتحان دینا تھا۔ میں نے اپنے نئے بھائی سے دلی "ہمدردی" کا اظہار کیا۔ خیر کسی طرح برات رخصت ہوئی۔ میں نے بھی چلنے کے لئے درخواست دی، لیکن منظور نہ ہوئی۔ "وہ" چلنے کے لئے تیار نہ ہوئیں، اندو نے بھی ضد کی اور مچلتی ہوئی بولی "ابھی تو آپ نے مجھے کسی روز سینما دکھایا ہی نہیں، نہ ساتھ شاپنگ کی"۔ چار و ناچار مجھے دو دن کے لئے رکنا پڑا۔

اندو کو مجھ سے کیوں اتنی دلچسپی تھی ——— ؟ وہ مجھے کیوں چھیڑتی رہتی تھی ——— ؟ میں سمجھنے کی امکانی کوشش کرتا، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا، ہاں اسی دن تو ——— شام ہو چکی تھی، ٹہلتے ٹہلتے ہم دونوں کافی دور دریا کے کنارے تک نکل گئے۔ فرحت بخش ٹھنڈی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چاند نکل آیا تھا۔ تاروں نے آنکھ مچولی کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ نیچے دریا کے نیلے پانی میں ان کا حسین عکس پڑ رہا تھا، جیسے اوپر بھی تارے نیچے بھی تارے ہوا پانی میں شوخ اور چنچل موجیں اٹھنے لگیں،

میں سوچنے لگا ـــــــ اندو کے دل میں بھی اسی طرح چنچل موجیں متحرک رہی ہوں گی۔ کافوری رنگ، لمبے کٹ کا سلونا چہرہ ـــــــ لانبی پلکوں کے سائے میں کوئی خاموش پیغام لئے ہوئے، موٹی موٹی مدعاتی آنکھیں ـــــــ باریک سلوی کی اوٹ میں سے جھانکتی ہوئی کسم کلیوں سے گوندھی ہوئی چوٹی میں لٹکتا ہوا گھنگھن پھُنہنا .... وہ سراپا حسن و ناز شعر و شباب کی دُنیا بنا رہی تھی۔ میں نے کسی جذبۂ بیتاب سے مغلوب ہو کر اُس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کچھ گنگنا رہی تھی۔

ڈگمگ ڈولے من کی نیا   کون دھرے پتوار ؟

میں نے سوچا۔ کنارے سے بندھی ہوئی کشتی کیوں نہ کھول لوں ؟ اور اسے ہولے ہولے خود ہی چلاؤں، اندو بیٹھی ہوئی گائے۔

من کی نیا ڈگمگ ڈولے

اور میری چھوٹی سی ناؤ اٹھلاتی، مچلتی موجوں کے بیتاب سینے پر تھرکنے لگی ـــــــ اندو کا گانا جاری تھا ـــــــ

پون چلے پور دیا

ڈولے نیا

من کی نیا

ڈگمگ، ڈولے من کی نیا !!

کون دھرے پتوار ؟

اس نے گانا بند کر دیا۔ میں نے دبی زبان سے کہا: "اندو ...... !"

وہ خاموش تھی ـــــــ

میں نے پھر کہا۔" اندو!"

وہ پھر بھی خاموش تھی۔

نہ جانے اُس بار وہ کیا دیکھ رہی تھی؟ اُسی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا۔

"جب آپ مجھے اندو کہہ کر بلاتے ہیں۔ تو میں اپنے دل کی پہنائیوں میں نہ جانے کیوں ایک بے اندازہ لذت محسوس کرتی ہوں"۔

"اندو کیا سچ کہہ رہی ہو ـــــــ؟"

وہ مخمور آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اندو کی چھلکتی ہوئی شراب آنکھوں سے پی رہا تھا ـــــــ میرے دل کا سفینہ بھی شوقِ بے قرار کی پُر شور موجوں میں ہچکولے کھا رہا تھا لیکن معاً جیسے مجھ سے کسی نے کہا ـــــــ

"کیا کر رہے ہو ...... ؟ وہ تو ابھی بھولی ہے، نادان ہے۔ اُس کی طرف ...... اس طرح نہ دیکھو ...... تمہیں کوئی حق نہیں ......"

میں سوچنے لگا ـــــــ حُسن ...... جوانی ...... مُسکراتی ہوئی آنکھوں کے خاموش بُلاوے ...... کتنے کیف زا ـــــــ کتنے سحر کار ہوتے ہیں ...... ذہن و دماغ اور عقل و ضمیر سب کے سب مدہوش و ماؤف ہو جاتے ہیں ـــــــ کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جانا ...... جان کر انجان بن جانا ...... یہی تو مرد اور عورت کی ہار جیت ہے ـــــــ میرے ضمیر نے مجھے سنبھالا ورنہ میں ......

"اندو بول اُٹھی۔ کیا سوچ رہے ہو جیجا جی ـــــــ؟"

"کچھ نہیں...... چلو اب چلنا چاہیئے، تمہاری بڑی جیجی راہ دیکھ رہی ہونگی، دیر بھی ہو گئی ہے۔" میں نے دبی زبان سے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا۔

اندو نے میری طرف دیکھا ——— اُف کتنی مستی تھی اُن آنکھوں میں ———

میں نے اس کی توجہ دوسری طرف پھیرنے کی کوشش کی اور کہا "کافی ٹھنڈک پڑ رہی ہے، سردی لگ رہی تو میرا چیسٹر پہن لو......"

"نہیں میں نہیں پہنوں گی، گھر چل کر بڑی جیجی کو پہنانا پیئے گا......" اندو نے کھلی ہوئی ناگن کی طرح بل کھا کر جواب دیا۔

کوٹ کی جیب سے دستانہ نکالتے ہوئے میں نے کہا "اچھا لو، دستانہ پہن لو۔"

"لو" مسکراتے ہوئے اندو اپنی شال ٹھیک کرنے لگی۔ پُروائی ہوا کی چال دھیمی ہو چلی تھی۔ پانی میں آہستہ آہستہ سکون پیدا ہو چلا تھا۔ میں نے مڑ کر اندو کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے ہنس کر کہا "ارے تم ذراسی بات میں روٹھ گئیں ——— ؟ تمہارا بچپن ابھی نہیں گیا ——— ؟"

اُس نے مدماتی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر انگڑائی لی اور طویل سانس کھینچ کر مسکراتی ہوئی بولی "میں بھی مذاق کر رہی تھی......"
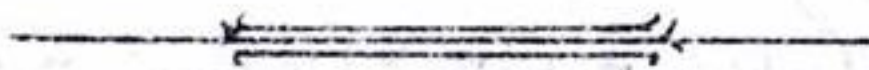
حُسنِ اتفاق

اپنے والد کے روز کے لیکچروں سے جن میں وہ پُر زور انداز میں شادی کے فوائد پر روشنی ڈالتے تھے۔ مہندر عاجز آچکا تھا۔ ایک شام کو بُوٹ کے تسمے باندھتے ہُوئے سوچا۔ ابھی مَیں ہوں ہی کِس قابِل؟ ایک معمُولی متعلم۔ ایک پیسہ بھی تو میری آمدنی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چند مہینوں میں ایم۔ اے کر لوُں گا۔ لیکن اس سے بھی کیا ہو سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ ڈگری لے کر نکلے اور ملازمت مِل گئی۔ نکٹائی کی گرہ دُرست کرتا ہُوا وہ سوچنے لگا۔ چلو آج کہیں سیر کر آئیں۔ اگر نہر پر جانے والی بس مِل جائے تو کیا پُوچھنا ہے۔ نہر کے ساحل کی ٹھنڈی ہواؤں سے

پتاجی کے لیکچروں کی گرمی تو کچھ دیر کے لئے دماغ سے دُور ہو جائے گی۔

باہر جانے کے لئے بالکل تیار ہو کر وہ ایک ہلکا سفید کوٹ پہن رہا تھا۔ اسے اندر کی جیب خلافِ معمول وزنی معلوم ہوئی۔ اُس نے ہاتھ ڈال کر اندر پڑی ہوئی ڈائری نکالی۔ اُس میں ایک نوجوان عورت کی تصویر پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اُسے بغور دیکھ کر دل ہی دل میں کہا۔ تصویر تو اچھی ہے لیکن صرف تصویر سے کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آج کل کے فوٹوگرافر تو کالی کلوٹی لڑکیوں کی بھی حسین تصویریں بنا سکتے ہیں۔ اور پتاجی ہیں کہ بس چاہتے ہیں تصویر ہی دیکھ کر میں فیصلہ کر لوں۔ لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔

یہ سوچتا ہوا ڈائری جیب میں ڈال کر مہندر گھومنے کے لئے نکل پڑا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

کچھ دُور جا کر مہندر نے مال روڈ پر پیچھے سے ایک بس آتی ہوئی دیکھی۔ اُس کے بالائی حصے پر بیٹھی ہوئی ایک نوجوان لڑکی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مہندر نے دُور ہی سے دیکھ کر دل تھام لیا۔ گلابی رنگ کی ساری میں اُس کا فرادا کا مرمریں جسم ہر چشم شوق کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ اتنے میں بس اس کے نزدیک آئی۔ مہندر کا ہاتھ اشارے کے لئے اٹھ گیا۔ اُس کی رفتار کم ہوئی۔ اور وہ بڑھ کر اُوپر چڑھ گیا۔

نیچے کوئی سیٹ خالی نہ تھی اس لئے مہندر چھت پر گیا۔ وہاں بھی یہی حال تھا۔ بلکہ کالج کے دو چار طلبہ تو کھڑے ہوئے جا رہے تھے۔ ہاں گلابی ساری والی لڑکی جس بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی وہاں ضرور ایک سیٹ خالی تھی۔ مہندر نے سوچا۔

معلوم ہوتا ہے۔ لڑکی کے ساتھ بیٹھنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکا۔ لیکن اگر میں وہاں بیٹھ جاؤں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

مہندر کو لڑکی کی بغل میں بیٹھتے دیکھ کر گھورتے ہوئے طلبہ زیرِ لب مسکرا دیئے۔ لیکن وہ برابر سڑک کی طرف دیکھتی رہی۔ جیسے اُسے مہندر کے وہاں بیٹھنے کا علم و احساس ہی نہ ہوا۔

چڑیا گھر کے پاس بہت سے لوگ اتر گئے۔ لیکن وہ لڑکی وہیں بیٹھی رہی اور مہندر بھی اُس کا فرادا کی بغل سے اُٹھ کر اپنے جمالیاتی ذوق کو رسوا نہ کر سکا۔ بس نہر کی طرف چل دی۔ لیکن وہ سڑک ہی کی طرف دیکھتی رہی۔

٭ ٭ ٭

مہندر نے سوچا۔ کتنی حسین گردن ہے۔ آنکھوں کی صہبا سے مستیاں چھلک رہی ہیں۔ اُمنڈتی ہوئی گھٹا کی طرح اُس کے مرمریں شانوں پر بکھرے ہوئے سیاہ اور چمکدار بالوں کو اُس نے بے اختیار چوم لینا چاہا۔ اُس کے دل میں معاً خیال گذرا کہ پتہ نہیں اس پیکرِ ناز کی صورت کیسی ہے۔ رنگ تو ضرور سفید ہے۔ لیکن جب تک اِدھر مُڑ کر نہ دیکھے۔ خدوخال کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے۔

مہندر کے دل میں شوق و آرزو کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اس سے کچھ بن نہ پڑا۔ تو وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ لیکن وہ ظالم بکمالِ ادائے بے التفاتی سڑک ہی کی طرف دیکھتی رہی۔

جب یہ تدبیر بھی ناکام ثابت ہوئی تو مہندر اپنے سر کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ اصل میں ٹھنڈی سڑک شروع

ہی یہاں سے ہوتی ہے۔"

لڑکی اب بھی خاموش رہی ———

"بس کے مال روڈ پر چلنے سے سہولت تو بہت ہو گئی ہے" مہندر نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لڑکی اب بھی مُنہ سے بولی۔ نہ سر سے کھیلی۔

مہندر حیران رہ گیا۔ سوچنے لگا۔ کیا اس لڑکی نے کانوں میں رُوئی ٹھونس رکھی ہے۔ جو سُنتی ہی نہیں۔ معاً اُس کے دل نے پھریری لی۔ اور اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ اب تو ظالم کو دیکھنا ہی پڑے گا۔ اُس نے فوراً جیب سے اپنی بہن کا لیڈیز پارکر پن نکال کر جسے اُس نے اسے مرمت کرانے کے لئے دیا تھا، چپکے سے لڑکی کی طرف بنچ پر رکھ دیا۔ اور بولا "اوہ دیکھئے تو یہ پن آپ کا گر گیا ہے؟"

لڑکی نے گردن پھیر کر پہلی بار اُس کی طرف دیکھا۔ اور اپنے جمالِ جہاں تاب کی تجلی سے مہندر کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ پھر دل رُبا انداز سے بولی "نہیں، میرا نہیں ہے، کہاں پڑا تھا؟"

"یہیں۔ نہ معلوم کس کا ہے۔ اب اسے کیا کرنا چاہیئے......؟"

"کرنا کیا ہے۔ اپنے پاس رکھتے۔"

"پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ یہ تو لیڈیز پن ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ آپ کو تو پن سے کام ہے نہ کہ اس کے نام اور شکل و صورت سے۔"

"کام تو پن ہی سے ہے لیکن سوچتا ہوں، لڑکے دیکھ کر ہنسیں گے اور کہیں گے

مہندر۔ یہ کس لڑکی کا پن اُڑا لائے ؟ آپ تو جانتی ہیں. کالج کے لڑکے کتنے شریر ہوتے ہیں اور خاص کر ہمارے کالج کے، گورنمنٹ کالج کے طلبہ تو ہر طرف بدنام ہیں۔"

"اچھا تو آپ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے ہیں ——؟"

"جی ہاں۔"

"کون سی کلاس میں ——؟"

"ایم۔ اے میں۔"

"اور کیا لیا ہے آپ نے فلسفہ یا تاریخ ——؟"

"تاریخ اور آپ ——؟"

"اوہ ...... میں ؟ میں تو کنیرڈ کالج میں پڑھتی ہوں۔ ایف۔ اے کے دوسرے سال میں۔"

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں ——؟"

"ہاں ہاں شوق سے۔"

"اوہ ! میرا مطلب ہے کہ آپ کا نام کیا ہے ؟"

"چاند رانی۔"

یہ کہہ کر لڑکی پھر سڑک کی دیکھنے لگی۔ مہندر نے آہستہ سے نام دُہرایا ——
چاند ! کتنا حسین نام ہے اور ہے بھی بالکل چاند ہی کی طرح۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس سے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں دیکھا ہے ؟ بہت زور ڈالنے پر بھی حافظہ کام نہیں کر رہا تھا۔ اتنے میں بس نہر پہ آ گئی سب لوگ اُتر گئے۔ وہ لڑکی

بھی ایک طرف تیزی سے چل دی۔ مہندر بھی اسی طرف چلا لیکن آہستہ آہستہ۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞

مہندر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے سارے جہاں کا حسن چاندرانی ہی میں سمٹ کر آگیا ہو! لبریز ساغر سی آنکھیں، گھنگھور گھٹاؤں کی طرح سیاہ بال، وہ مہکی ہوئی ریشمیں اس کی زلفیں ——— وہ اُبھرا ہوا کیف زا اُس کا سینہ۔ نکھری جوانی، کافر ادائیں۔ وہ سوچنے لگا۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ خواب میں یا بیداری میں؟ معاً ہی خیال گزرا۔ میں بھی کتنا بھولنے والا ہوں اور ساتھ ہی جیب میں رکھی ہوئی تصویر نکالی اور بے اختیار بول اٹھا "خوب! بالکل وہی! یہ فوٹوگرافر بھی کتنے بددماغ ہوتے ہیں! اتنی حسین لڑکی کی کتنی بھدی اور بھونڈی تصویر بنائی ہے۔ کتنا فرق ہے، جبھی تو میں سمجھ نہ سکا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

نہر کے کنارے کنارے تیز چلتی ہوئی چاندرانی کے پیچھے آہستہ آہستہ مہندر بھی جا رہا تھا۔ نہر میں نہاتے ہوئے نوجوان کھڑے ہو ہو کر اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھ لیتے تھے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں دادِ تحسین دے کر پھر نہانے میں مشغول ہو جاتے تھے۔

تصویر دیکھ کر اُس پر چاندرانی کا گمان ہوتے ہی مہندر کی رفتار بھی کچھ تیز ہو گئی اور اُن دونوں کے درمیان جو فاصلہ ہو گیا تھا۔ بتدریج کم ہونے لگا۔

اتنے میں مہندر نے دیکھا کہ ایک شکیل نوجوان نیم بھیگے کپڑے پہنے چاندرانی کی طرف چلا آرہا ہے اور وہ بھی اُسی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ مہندر رشک و رقابت کی آگ سے جلنے لگا۔ پھر سوچنے لگا۔ بہت ممکن ہے۔ اس کا بھائی ہی ہو۔

چاند رانی اور وہ نوجوان سڑک کی ایک طرف کھڑی موٹر کی طرف گئے۔ جس میں دو ایک بچے اور ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اب مہندر کو یقین ہو گیا کہ یہ سب چاند رانی ہی کے گھر کے آدمی ہیں۔ وہ سب پہلے آگئے ہونگے اور کسی مجبوری سے یہ بعد میں بس سے آئی ہے۔ یقیناً یہی بات ہے اور یہ سب موٹر میں واپس جائیں گے مہندر سوچنے لگا۔ کاش میں بھی ان کے ساتھ جا سکتا۔

یہ سوچتا ہوا وہ موٹر کے پاس چلا۔ نیم بھیگے کپڑے پہنے ہوئے نوجوان نے اُسے دیکھتے ہی کہا "ہلو مسٹر مہندر!"

"ہلو ـــــ رمیش، ارے کب آگئے ولایت سے ـــــ؟"

"بہ خوب رہی، مجھے آئے ہوئے تو پورا ایک مہینہ ہو گیا۔"

"اچھا کیا۔ مجھے خبر تک نہ دی۔ کہو اچھے تو رہے؟"

"ہاں بھائی، ولایت میں عیش و راحت کی کیا کمی ہے۔ اب تو تم ایم۔ اے کرنے والے ہو گے؟"

"ہاں کوشش تو کر رہا ہوں۔"

"چلو تمہیں اپنی ماتا جی اور بہن جی سے ملاؤں پتا جی تو ابھی نہا رہے ہیں۔" رمیش نے اپنی ماں اور بہن کا مہندر سے تعارف کرایا۔ چاند رانی کو نمستے کہتے ہوئے وہ کچھ شرما سا گیا لیکن دل ہی دل میں اپنی قسمت کو سراہ رہا تھا۔ چاند رانی نے بھی اس کے نمستے کا جواب کچھ محجوب ہی ہو کر دیا۔ اور اس کے حسین رخساروں پر ایک ہلکی سرخی دوڑ گئی لیکن شام کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں کوئی اُسے نہ دیکھ سکا۔

رمیش کے والد کے غُسل سے فراغت پانے کے بعد موٹر اسٹارٹ ہونے لگا۔ رمیش نے مہندر سے کہا "چلو تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔ بُہت دنوں کے بعد ملے ہو۔ کچھ اپنی کہو۔ کچھ میری سُنو"۔

"شکریہ! بھلا مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے"۔

مہندر اور رمیش کے والد ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ رمیش کے والد نے پُوچھا۔ "مہندر! تمہارے پتاجی کا شُبھ نام کیا ہے؟"

"لالہ چرنجن لال سیٹھ"۔

"اچھا، کیا وہ جہلم کے رہنے والے ہیں؟"

"جی ہاں"۔

اس کے بعد وہ مہندر کے بارے میں کچھ سوالات کرتے رہے۔ اتنے میں موٹر مکان پر پہنچ گیا۔

* * * * * *

اسی رات مہندر کے گھر میں

"نمستے پتاجی"۔

"خوش رہو، کہو بُہت دیر سے گھر واپس آ رہے ہو، کھانا بھی نہیں کھایا، کیا سنیما چلے گئے تھے؟"

"نہیں نہر پر گھُومنے گیا تھا، وہاں ایک میرا دوست حال ہی میں ولایت سے آیا ہُوا مل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا"۔

"اچھا مہندر! میں آج تم سے ایک بات پُوچھنا چاہتا ہُوں"۔

"کہئے........"

"تم نے اُس بارے میں کیا فیصلہ کیا ——؟"

"کس بارے میں؟"

"ابھی پرسوں میں نے نارائن داس کی بھیجی ہوئی اُن کی بیٹی چاندرانی کی تصویر تمہیں دی تھی۔ لڑکی کا نام بتانا تو مَیں بھول ہی گیا تھا۔ لیکن نام میں کیا رکھا ہے۔ خیر، تم نے کہا تھا کہ فوٹو دیکھنے سے کیا پتہ چل سکتا ہے؟ ملاقات کئے بغیر کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ کیا مَیں انہیں لکھ دوں کہ رشتہ طے ہونے سے پہلے ملنا ضروری ہے۔ ویسے تو مَیں ایسی باتوں کو بیہودگی سمجھتا ہوں۔"

"پتاجی اگر آپ کو گھر اور خاندان کے بارے میں اطمینان ہے تو رشتہ طے کر دیجئے۔ ملاقات کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن ابھی کل تو تم نے کہا تھا کہ خود دیکھے بغیر شادی نہ کروں گا۔"

"کہا تھا تو کیا ہوا، مَیں آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔ مجھے تم جیسے لائق بیٹے سے یہی توقع تھی کہ آج کل کے کالج زدہ لڑکوں کی طرح لڑکی کو دیکھنے کے لئے ضد نہ کرو گے۔ مَیں سویرے ہی اُنہیں خط لکھ دوں گا۔"

اُس دن مہندر اپنے مکان کی چھت پر لیٹا ہوا چاندنی رات میں چاندرانی کے تصور میں کھویا ہوا نہ جانے کتنی دیر کے بعد سویا۔

٭ ٭ ٭ ٭

سہاگ کی رات چاندرانی حجلۂ عروسی میں لجائی سمٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ مہندر

اپنے دِل میں شوق و آرزو کی ایک دُنیا لئے ہوئے اندر داخل ہوا اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا "گھونگھٹ پٹ کھولو نا سجنی" نئی نویلی دُلہن شرم سے اور بھی سمٹ گئی۔ مہندر نے اس کی مرمریں ٹھوڑی پکڑ کر اُوپر اُٹھایا تو چاندرانی نے دیکھا بس والے نوجوان کی ہنستی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں سمائی جا رہی ہیں۔ وہ بھی شرما کر زیرِ لب مُسکرا دی +

شوہر چاہتا تھا کہ بیوی اپنے مُنہ سے میرا نام لے ــــــــ

"میرا نام کیا ہے؟ کہو تو ذرا" شوہر نے ہنس کر پُوچھا۔

بیوی خاموش تھی لیکن اُس کے ابرُوؤں میں جو بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ اُس کے ہونٹوں پر کھنچے ہُوئے مُسکراہٹ کے نقوش سے صاف اختلاف کا اظہار کر رہے تھے۔

جُوں جُوں کملا جُھنجھلاتی تھی۔ شوہر کا چِڑانے کا شوق بڑھتا جاتا تھا، اور وہ بار بار اپنا سوال دُہراتا تھا "بولو"

کملا نہ بولی ——————

اُس کے حسین مکھڑے پر غصّے کی خفیف علامتیں ہویدا تھیں۔

"بتاؤ میرا نام" شوہر نے ضد نہ چھوڑی۔

کملا خاموش رہی، جیسے بولنا جانتی ہی نہ ہو۔

"میں پوچھنا چاہتا ہوں، میرا نام کیا ہے ——————؟"

"میں کیا جانوں ...." بیوی نے شوہر کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"واہ یہ خوب رہی" شوہر نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہا "کسی بے گناہ کو زندگی بھر قید رکھنے کا ٹھیکہ تم نے لے لیا لیکن اتنا نہیں جانتیں کہ وہ کون ہے۔ اس کا نام کیا ہے ——————؟"

کملا نے آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور مسکرا کر کہا۔ "نہیں جانتی ......"

"اچھا تو میں بتائے دیتا ہوں" شوہر نے کہا۔ "میرا نام پریاگ دت شرما ہے۔ کہو شری یُت پریاگ دت ...."

"میں نہیں کہتی، تمہارا نام یہ نہیں ہے"

"پھر کیا ہے ——————؟"

"شری یُت اے۔جی۔"

"دیکھو، مجھے اے جی، او جی، کیوں جی وغیرہ نام پسند نہیں، نہ مجھے یہی پسند ہوگا کہ مجھے ہونے والے للّہ یا للّی کے باپو جی کہہ کر بلایا جائے۔ تم مجھے اے جی نہ کہا کرو۔"

"مَیں تو تمہارا یہی نام جانتی ہُوں"۔ شوخ و شنگ کملا نے مُسکراتے ہُوئے آنکھیں نچا کر کہا۔

"کہو تو میں اپنا یونیورسٹی کا ڈپلوما نکال کر دکھا دُوں۔ میرا صحیح نام ہے پریاگ دت شرما"

"مجھے ڈپلوما سرٹیفکیٹ دیکھنے کی ضرورت نہیں"

"میرا نام لینے میں ہرج ہی کیا ہے ——؟"

"ہو یا نہ ہو، مَیں نہیں لینے کی"

"مَیں تو تمہارا نام لے سکتا ہُوں"

"نہیں لے سکتے"

"کیوں نہیں۔ ک..... م..... ل....."

کملا نے شوہر کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی "پریشان کروگے تو اچھا نہ ہوگا"

"کیا کروگی ——؟"

"رو دُوں گی" کہہ کر کملا ہنس پڑی۔

"تمہارا سارا لکھنا پڑھنا فضول ہی گیا" پریاگ دت نے کہا "اگر پُرانی رسمیں پاؤں کی زنجیریں ہی رہیں تو کالج میں مغز پچی کرنے سے فائدہ ہی کیا ہُوا؟"

"ایسے فائدے سے میرا نقصان ہی بھلا"

"اسٹور کے لئے تم اونچی ایڑی کے جوتے نہ پہنا کرو، یہ تم جیسی دیویوں کو شوبھا نہیں دیتے، جو شوہر کا نام لینا بھی پاپ سمجھتی ہیں"۔ شوہر نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"نہ پہنتی لیکن تم جیسے شوہر کے ساتھ میں چھوٹی لگوں گی، یہی خیال ہے"۔ کملا

نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"تو اسی شوہر پر کرم کر کے اتنا خیال اور رکھو کہ اسے جی او جی نہ کہا کرو، میں تمہیں مسز پریاگ دت کہا کروں اور تم مجھے ......"

"اور میں تمہیں مسٹر کملا کہا کروں"۔ درمیان ہی میں کملا بول اٹھی اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ——؟"

"جیسے مرد کے نام سے پہلے مسز لگا کر عورت بنایا جا سکتا ہے اسی طرح عورت کے نام سے پہلے مسٹر لگا کر مرد بنا سکتے ہیں"۔

"تم بہت شریر ہو"۔

واقعی تعلیم یافتہ ہو کر بھی کملا اس معاملے میں بہت تاریک ذہنیت رکھتی تھی۔

* * * * * *

پریاگ دت بیوی کو میکے پہنچانے کے لئے اسٹیشن گئے، تو انہوں نے ٹکٹ لینے کا کام کملا کے سپرد کر دیا۔ کیونکہ ٹکٹ پریاگ کے لینے تھے۔ اس لئے بکنگ کلرک سے ٹکٹ مانگتے وقت جیسے بھی ہو' پریاگ کا نام لینا ضروری تھا۔ انہوں نے سوچا دیکھوں اب شریمتی جی کیا کرتی ہیں۔

کملا جا کر ٹکٹ لے آئی۔ پریاگ دت نے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا اور ہنس کر کہا "آخر تمہیں میرا نام لینا ہی پڑا"۔

"کیوں آپ کا نام کیوں لینے لگی ——؟" کملا نے آنکھیں نچا کر کہا۔

"پریاگ اسٹیشن کا نام لینا میرا ہی نام لینا ہوا"۔

"تو اسی غرض سے تم نے مجھے ٹکٹ لینے کے لئے بھیجا تھا؟ اب سمجھی"۔

"جی ہاں اور آج میں جیت گیا"۔

"جی نہیں"۔ کملا نے مسکرا کر کہا۔ "میں الہ آباد کے ایک اسٹیشن پہلے کا ٹکٹ لائی ہوں!"

جھینپ مٹانے کے لئے پریاگ دت نے کہا۔ "اُنہہ مجھے کیا۔ یہی حال رہا اور تم نے ضد نہ چھوڑی تو کسی دن دھوکا کھاؤ گی، اُسی وقت معلوم ہو گا"۔

"اُنہہ دیکھا جائے گا"۔

* * * * * *

پریاگ دت کملا کو میکے پہنچا تو آئے لیکن لینے نہ جا سکے ـــــ

ایک دن کملا کو ان کا خط ملا ـــــ

"پیاری ...... میری طبیعت یکا یک کچھ خراب ہو گئی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ افسوس ہے کہ تمہیں لینے کے لئے ابھی نہ آ سکوں گا۔ ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے"۔

کملا سوچ میں پڑ گئی۔ اُس کے دونوں بڑے بھائی باہر گئے ہوئے تھے۔ چچا بھی نہ تھے۔ بوڑھے باپ سفر کرنے سے معذور تھے۔

پریاگ دت نے لکھا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور انہوں نے کملا کو بُلایا بھی نہ تھا لیکن اُسے خوب معلوم تھا کہ وہاں مریض کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں، اس لئے اس نے اپنے فرض کا احساس کرتے ہوئے اپنی ماں کو سمجھایا کہ میں پڑھی لکھی ہوں، اکیلی ہی چلی جاؤں گی، ہرج ہی کیا ہے؟

"کہیں بھول بھٹک نہ جانا"۔ بوڑھی ماں نے ازراہِ احتیاط کہا۔

"نہیں ایسا کیا ہوگا؟" کملا نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

اور دوسرے دن وہ فیض آباد جانے والی گاڑی کے زنانے انٹر کلاس میں تھی۔ اُس کے ذہن میں شوہر کی علالت سے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی مکان بدلتے ہی بیمار پڑ گئے۔ مکان میں تو کوئی خرابی نہیں، کوئی بھوت پریت تو نہیں۔ میں جاتے ہی اُسے بھی بدلوا دوں گی۔

پہلا مکان اوّل تو پریاگ دت کے کالج سے بہت دور پڑتا تھا۔ دوسرے تنگ بھی تھا اس میں دو ہی آدمی مشکل سے رہ سکتے تھے۔ پریاگ دت کے چھوٹے بھائی کے لئے اُس میں مطلق گنجائش نہ تھی۔ چھوٹا بھائی جلد ہی آنے والا تھا جنگ کے باعث وہ ولایت میں نہیں رہ سکتا تھا۔

کملا دیور کو دیکھنے کی مشتاق تھی۔ اُس نے اسے کبھی نہ دیکھا تھا، لیکن اُس کے آنے سے پہلے اُسے چلا جانا پڑا۔

ولایت سے لوٹے ہوئے مہذب نوجوان کو چھوٹے سے مکان میں رہنے کے لئے مجبور کرنا کملا کی رائے میں اچھی بات نہ تھی۔ اس مکان کو بدلنے کی بات بہت دنوں سے چل رہی تھی۔ لیکن اسے چھوڑنے کی نوبت اب آئی۔ اسی درمیان میں پریاگ دت بیمار ہو گئے۔

اسٹیشن آگیا۔ کملا اُتری۔ اس کے سامنے ایک اہم مسئلہ درپیش تھا۔ اِس نئے مکان کا پتہ معلوم نہ تھا۔ پریاگ دت کے خط سے اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اب رِسی ٹولہ میں مکان لیا گیا ہے، جسے اصلاح پسند لوگ رشی ٹولہ بھی کہتے ہیں۔

تار کے ذریعے سے اپنے آنے کی اطلاع دینے پر بھی اُس نے شوہر کو پلیٹ فارم پر نہ دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ یقیناً زیادہ بیمار ہیں۔

اسٹیشن سے باہر آکر کملا نے ایک تانگے والے سے پوچھا۔ "رشی ٹولہ چلو گے ———؟"

ساتھ ہی ایک شخص پیچھے سے آیا اور بولا۔ "ارے بھئی مجھے بھی رشی ٹولہ جانا ہے، بولو، کیا لو گے ———؟"

بھویں سکیڑ کر کملا نے نوجوان کو دیکھا۔ اسے اپنے معاملے میں اس کا دخل انداز ہونا بہت بُرا لگا۔ لیکن اُس نے مول تول کر کے تانگہ ٹھیک کر ہی لیا۔ کملا شش و پنج میں پڑ گئی۔ پہلے تو وہ جھجکی۔ پھر سوچا، چلو یہ شخص اسی محلے میں رہتا ہے۔ اس سے اُن کا پتہ لگانے میں آسانی ہو گی۔

اُس نے نوجوان سے نصف کرایہ دے دینے کی بات طے کر لی اور دونوں آگے پیچھے تانگے پر بیٹھ گئے۔ نوجوان دیکھنے میں بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بھرا بھرا سدول چہرہ، شریف صورت، اُس سے کسی بد تہذیبی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

"آپ کس کے ہاں جائیں گی ———؟" نوجوان نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پُوچھا۔

"جی ———؟" کملا نے کہا۔ "اپنے مکان جاؤں گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن میرا مطلب ہے کہ آپ ...... آپ ...... آپ کس کے ہاں رہتی ہیں؟" نوجوان نے ذرا جھجکتے ہوئے پُوچھا۔

"اپنے شوہر کے ہاں رہتی ہوں اور کہاں رہوں گی؟" کملا کے دل سے نوجوان

کی شرافت کا اعتبار اُٹھنے لگا۔

" ہاں ہاں یہ تو درست ہے لیکن میں اُن کا نام پوچھ رہا تھا"۔ نوجوان نے ہنس کر کہا۔

" جی...... ایس...... جی...... ایس"۔ کملا نے ہکلا کر کہا۔ "میرے پتی کا نام پوچھا آپ نے ـــــ؟"

" جی ہاں، آپ نے صحیح سُنا ہے"۔

" اُن کا نام...... ایس...... ایس...... ایس" اور دفعتاً اُس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اُس نے شوہر کا سیدھا نام لینے کی بجائے کہا۔ "اُن کا نام ہے پی۔ ڈی۔ شرما"۔

نوجوان مسکرا کر بولا۔ "انہیں تو میں خوب جانتا ہوں"۔

" تو اُن کا مکان آپ مجھے بتا دیں گے ـــــ؟"

" کیوں، کیا آپ نہیں جانتیں ـــــ؟"

" نہیں"۔

" چلئے پھر تو اچھا ہوا، جو میں آپ کو مل گیا"۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کملا کچھ نہ بولی ـــــ

گلی کے موڑ پر تانگہ چھوڑ کر دونوں آگے بڑھے۔ ایک مکان کے سامنے پہنچ کر نوجوان نے کہا۔ "پی۔ ڈی شرما کا یہی مکان ہے اور اس کی بغل میں میرا ہے"۔

کملا اندر چلی گئی۔ لیکن وہاں ایک موٹے مسٹنڈے سیاہ فام آدمی کو دیکھ کر گھبرا گئی۔

"آپ کون ہیں ———؟" کملا نے تعجب سے پوچھا۔

"مَیں ———؟ مجھے لوگ پی۔ ڈی شرما کہتے ہیں"۔ بوڑھے نے کملا پر سوالیہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

کملا اُلٹے پاؤں بھاگی۔ بوڑھا پوچھتا ہی رہ گیا "کہئے کیا بات ہے ———؟"

کملا غصے میں بھری ہوئی بغل والے مکان کے دروازے پہ گئی کنڈی کھٹکھٹانے پر اُسی نوجوان نے کہا "اندر آیئے ...... کون؟ ...... آپ ...... ؟"

"ہاں" کملا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے دھوکا کیوں دیا؟ غلط مکان کیوں بتایا؟"

"بات کیا ہے؟ کیا اس میں پی۔ ڈی شرما نہیں رہتے؟" نوجوان نے کملا پہ متعجب نگاہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"وہ پی ڈی شرما ہوں یا سی۔ ڈی شرما۔ میرے شوہر نہیں ہیں"۔

"تو مَیں کیا کروں ———" نوجوان بولا۔ "آپ نے پی ڈی شرما کا مکان پُوچھا، مَیں نے بتا دیا۔ مَیں کیا جانوں، کون کس کا شوہر ہے، کون کس کی بیوی!"

"کیا مَیں اُس کالے کلوٹے کی بیوی ہونے کے لائق ہوں؟ کیا آپ کبھی اس کی توقع کر سکتے تھے؟"

"یہ اَن ہونی بات تو نہیں، اِس مُلک اور سماج میں اَن میل شادیاں نئی چیز تو نہیں ہیں، یہ ہندوستان ہے ———!"

"آپ کو مجھ پہ فقرہ کسنے کا کیا حق ہے؟" کملا نے ذرا تیز ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں اور مَیں آپ پہ فقرہ کس بھی نہیں رہا ہوں۔ آپ خود ہی اتنی سیدھی

ساری بات پر اُلجھ رہی ہیں"۔

کملا کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی، کیا کہے کیا نہ کہے ——

"وہ ٹھیک ہی کہتے تھے اکسی نہ کسی دن دھوکا کھاؤ گی"۔

"کیا مطلب ——؟" نوجوان نے پھر چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

"جو مطلب بھی ہو"۔ کملا نے ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سے غرض۔ تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟"

"نصیب کی بات۔ واقعی آج بلا وجہ بلا غرض بھلی کٹی سُن رہا ہوں۔ آپ عورت ہیں اسی لئے کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"میں عورت ہوں، اسی لئے مجھے پریشان کرنا مناسب تھا ——؟"

"یہ خوب رہی۔ مجھ سے پی۔ ڈی شرما کا مکان پوچھا گیا۔ میں نے بتا دیا کہ پربھو دیال شرما اسی میں رہتے ہیں۔ وہ بغل میں پی۔ ڈی شرما کے نام کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے۔ اس میں لال پیلا ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ بھی مجھے کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی ہیں جس غریب کے سر آپ پڑی ......"

"پربھو دیال شرما ——؟" کملا درمیان ہی میں بول اُٹھی "میرے شوہر کا نام پربھو دیال نہیں ہے"۔

"آپ ہی نے تو پی۔ ڈی شرما کہا تھا"۔

"اُن کا نام پریاگ دت شرما ہے"۔ کملا کو مجبور ہو کر نام بتانا ہی پڑا۔ اُس نے لجاجت سے کہا۔ "مہربانی کر کے اُن کے ہاں پہنچا دیجئے"۔

"ہری ——" نوجوان نے زور سے کہا اور اندر بھاگ گیا "بھائی صاحب! بھائی صاحب بیٹھیے بھابی نے آج ہار مان لی!"

بیوی

جینت میرے بے تکلّف دوستوں میں ہے۔ وہ مجھے دیوتا سمجھتا ہے، میں اُسے۔ پرسوں اُس کا خط آیا تھا، اس کی بیوی منورما اپنے میکے جانے والی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ راستے میں اُتر کر مجھ سے ملتی جائے، آج اس کے لکھنے کے مطابق منورما آگئی۔ وہ مسکراتی ہوئی تانگے سے اُتری اور دل فریب انداز سے دونوں ہاتھ جوڑ کر اُس نے کہا "نمستے"۔

مجھے عورتوں سے ملنے جُلنے کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے۔ اور ایک جوان عورت سے اِس طرح براہِ راست تخاطب کا تو یہ پہلا ہی موقع تھا۔ میں منورما کو اپنے سامنے

دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا، میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ گھبراہٹ کس قسم کی ہے۔ میں نے بھی کسی طرح کہہ دیا "نمستے"۔

منورما بالکل نئی روشنی کی عورت ہے، سر کے بال دل فریب وضع سے سنورے ہوئے، ہلکے فیروزی رنگ کی جاپانی جیٹ کی ساڑی، سرخ رنگ کی خوبصورت چپل، سر سے پاؤں تک حسن و شباب اور رنگ و لطافت میں ڈوبی ہوئی۔ میں اخلاق کا بہت بلند نہیں تو ایسا گیا گزرا بھی نہیں، لیکن منورما کو دیکھ کر مجھے پہلی بار اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔

تانگے کی آواز سن کر موہنی اندر سے آئی اور منورما کو اپنے ساتھ لے گئی۔ دونوں کے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر بھی ان کے ملنے اور باتوں کے انداز کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان میں برسوں سے راہ و رسم نہیں۔

مجھے ایسا معلوم ہونے لگا، میری کوئی چیز کھو گئی ہے، جسے میں تلاش کرنا چاہتا ہوں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا، وہ کیا چیز ہے اور کیونکر دستیاب ہو سکتی ہے۔

منورما موہنی کے ساتھ اندر چلی گئی تھی، لیکن اس کا مسکراتا ہوا حسین چہرہ اب بھی میری آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا، میرا دل اس طرح منورما کی طرف کیوں کھنچا جا رہا ہے۔ کیا اس لئے کہ جینت میرا دلی دوست ہے اور منورما اس کی بیوی ہے!

میری شادی کو پانچ سال ہو چکے ہیں، اس طویل عرصے میں میں نے موہنی میں کسی طرح کی کمی محسوس نہیں کی، لیکن آج نہ جانے کیوں میرا دل بار بار منورما سے موہنی کا مقابلہ کر رہا تھا اور مجھے منورما کے مقابلے میں موہنی میں طرح طرح کی کمی

نظر آ رہی تھی۔

زندگی میں ایسی حالت سے مجھے کبھی دو چار ہونا نہیں پڑا تھا۔ منورما کا آنا موہنی کے لیے تو انتہائی مسرت کا باعث ہوا، وہ اس کے ساتھ باتیں کرتی، ہنستی خوش ہوتی، لیکن میں تنہا ہو گیا، جیسے موہنی کو بھی کھو بیٹھا۔ رات کو دونوں اسی کمرے میں سوئیں، جس میں موہنی کے ساتھ میں سویا کرتا تھا۔ جیسے منورما نے میری جگہ لے لی۔

ایک بار میری طبیعت بہت پریشان ہوئی تو کتاب لینے کے بہانے میں اس کمرے میں گیا۔ دیکھا دونوں باتیں کر رہی ہیں۔ موہنی نے مجھے دیکھا تو کہا۔

"ارے آپ یہاں کب سے کھڑے ہیں، چوروں کی طرح ......"

منورما شوخی سے بولی "تم جاؤ نا بہن، میں ہار مانے لیتی ہوں"

میں نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا "تم نے کول کی پولیٹیکل ایکانومی دیکھی ہے موہنی؟"

موہنی چڑ کر بولی "جب دیکھو ان پہ کول ہی کا بھوت سوار رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا بھئی کر لو جتنی شکایت چاہو"

نیچے آ کر میں نے ریڈیو کھول دیا، لیکن خبروں میں رکھا ہی کیا تھا۔ ولایت خاں کے ستار، نارائن راؤ کے گانے اور مس منی کے گیت سے بھی جی نہ بہلا۔ میں اسے بند کر کے پلنگ پر جا لیٹا لیکن نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

اوپر کی منزل سے اب تک منورما کے نقرئی قہقہوں کی آواز آ رہی تھی، میں پلنگ پر پڑا سوچ رہا تھا منورما اتنی شوخ اور بیباک کیوں ہے۔ ٹرین پر تنہا سفر

کرتی ہے، بات چیت کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتی کس طرح ہنستی اور قہقہے لگاتی ہے۔ موہنی میں ان میں سے کوئی بات نہیں، نہ اب اس میں یہ باتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

منورما صرف ہم لوگوں سے ملنے آئی تھی، مل چکی تھی۔ اس لئے آج اسے جانا تھا، لیکن جب وہ جانے کے لئے تیار ہوئی۔ تو میری زبان سے بے اختیار نکل گیا "آج اور رہ جائیے، ایسی جلدی کیا ہے؟"

میرے کہنے کے ساتھ ہی موہنی نے بھی منورما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ٹھہر گئی لیکن میں اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتا کہ موہنی نے جس جذبے سے بھی منورما کو روکا ہو، لیکن میرے اندر ایک خاص جذبہ کام کر رہا تھا۔

منورما ایک آزاد چڑیا کے مانند تھی۔ جس درخت اور جس شاخ پر چاہے، اُڑتی پھرے۔ اسے کوئی قید و بند نہیں، اس کی اس آزادہ روی نے میری مشکل کو بھی آسان کر دیا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ میں اس کے پاس کیسے جاؤں، اسے کس طرح اپنے پاس بلاؤں، کیسے اس سے بات چیت کروں؟ لیکن وہ خود دن میں بار بار میرے پاس آئی۔ بات چیت کی اور ہنسی بولی۔

دوسرے دن جب منورما کے جانے کا وقت ہوا تو میرے دل میں پھر طوفان اُٹھنے لگا۔ میں نے موہنی سے کہا "منورما کو کسی طرح آج اور روک لو۔"

منورما آج پھر رک گئی لیکن میں نے سوچا۔ کل کیا ہوگا؟ دل نے کہا۔ بہت حیلے ہیں، اور یہی ہوتا رہا کسی دن گھڑی سست کر دی جاتی کسی دن سامان چرا

دیا جاتا، کسی دن کوئی اور ترکیب کر دی جاتی۔ میرا خیال تھا منورما کے اس طرح دو چار دن رہ جانے سے اس کی طرف سے دل سیر ہو جائے گا۔ لیکن دل کا یہ علاج اُلٹا مرض ثابت ہوا۔ آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے اور بھڑکتی ہی چلی گئی۔

منورما کے میکے میں شادی تھی، دو چار روز پہلے نہ پہنچی تو بہت شکایت ہوتی۔ اس لئے اب اُس کا جانا ضروری تھا، لیکن میں منورما کے جانے کے تصور ہی سے پریشان ہو جاتا۔ میں جس راستے پر چل رہا تھا۔ اس پر تیز تیز قدم بڑھاتا اس مقام پر پہنچ گیا تھا۔ جہاں دیانت و بصیرت کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جہاں سب کچھ جذبات ہی ہوتے ہیں!

میں ایک مفکر کی طرح صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ جو شخص پیاسوں مر رہا ہو۔ اسے اگر اتنا پانی نہیں مل سکتا کہ وہ سیراب ہو سکے تو گھونٹ دو گھونٹ جو مل جائے وہی سہی، پھر اگر دریا سے کوئی ایک دو بار اپنی پیاس بھی بجھالے تو اس سے دریا میں کچھ کمی تو آ نہیں جاتی اور پیاسے کی سیری ہو جاتی ہے ...... تو مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ ...... دل کی بات صاف صاف کہہ دینا چاہیئے لیکن اس کے سامنے یہ بات کیسے زبان پہ آئے گی؟ ..... لیکن اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ ...... پیاسے کا کسی سے پانی مانگنا تو کوئی گناہ نہیں، گناہ تو ہے پیاسوں مر جانا ...... تو میں آج منورما سے اپنے دل کی بات کہہ دوں؟ اگر زبان سے کہنا مشکل ہے تو لکھ کر بھی اظہارِ مدعا کیا جا سکتا ہے۔ یہی صورت مناسب ہے ...

میں اسی وقت منورما کے لئے رقعہ لکھنے بیٹھ گیا۔ ابھی دو چار ہی سطریں لکھی ہوں گی کہ موہنی آگئی، میں نے اس کاغذ کو جلدی سے دوسرے کاغذوں میں چھپا

دیا، میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اگر وہ اس کاغذ کو مانگ بیٹھی تو کیا ہوگا؟
لیکن وہ ایک بار کنکھیوں سے میری طرف دیکھ کر چلی گئی۔

رقعہ لکھ تو دیا لیکن اب سوال تھا، اسے منورما کے دینے کا، اور اس کا کوئی حل نہ تھا۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد بھی جب کوئی صورت سمجھ میں نہ آئی تو میں نے خط کو دراز میں رکھ دیا۔ اور لگا کوئی دوسری تدبیر سوچنے۔

ایک صورت سمجھ میں آئی، موہنی کو سینما بھیج دیا جائے، لیکن وہ تنہا جائیگی؟ اسے کسی طرح کا شک نہ ہوگا؟ خالی گھر، منورما کے ساتھ میرے رہنے پر؟......
مجھے کوئی ایسی بات بنانی پڑے گی کہ وہ تنہا سینما جانے پر آمادہ ہو جائے، اس کے بعد اُسے شک ہو تو ہوا کرے، مجھے اس کی پروا نہ ہونی چاہیئے.........
تو کیا موہنی سے جھوٹ بولنا مناسب ہوگا؟........ ہاں ہاں، محبت میں کوئی بات نامناسب نہیں.......

* * * * *

میں رات کو نو بجے تک فضول اِدھر اُدھر چکر لگا کر گھر آیا اور موہنی سے کہا:
"تمہارے بھائی آئے ہوئے ہیں"
موہنی بولی "تم جھوٹ کہتے ہو"
"واہ اس میں جھوٹ کی کونسی بات ہے، پھر میں تم سے کبھی جھوٹ بولتا ہوں"۔
"قسم کھاؤ"
"تمہاری قسم"
"تو انہیں چھوڑ کہاں آئے ہیں؟"

" سنیما میں، مَیں تو اسے ایک بار پٹنے میں دیکھ چکا ہوں، بہت اچھی فلم ہے
مَیں نے تو ان سے کہا، چھوڑو فلم کو، چلو گھر......... لیکن تم تو جانتی ہو، آج
کل عزیزوں کے ہاں جانا ہو یا نہ ہو، لیکن سنیما نہ چھوٹے، وہ نہیں مانے چلے گئے۔"

موہنی منورما سے مخاطب ہو کر بولی "بہن تیار ہو جایئے سنیما چلنا ہے۔"

مَیں درمیان میں بول اٹھا "وہ نہ جائیں گی۔"

موہنی نے کہا "کیوں ؟"

مَیں نے کہا "تم بھی عجیب عورت ہو، وہ ایک دن کے لئے تمہارے پاس
آئیں تو جہاں جاؤ گی انہیں ساتھ لئے پھرو گی ؟"

موہنی بولی "اچھا بھئی تو اپنی اسپیچ رہنے دو، تم دونوں گھر رہو، مَیں اکیلی ہی
جاؤں گی۔"

موہنی نے منورما سے پوچھا "کیوں بہن، تمہیں اکیلے رہنے میں تو کوئی بات
نہیں ؟"

منورما بولی "اوہ، بات کا ہے کی بہن!"

مجھے اُمید نہ تھی کہ موہنی اتنی جلدی سنیما جانے کو تیار ہو جائے گی، لیکن
اکثر تجربے میں آیا ہے کہ جو کام سوچنے میں مشکل معلوم ہوتا ہے، وہ بہت بڑی آسانی
سے انجام پذیر ہو جاتا ہے۔

موہنی کے جانے کے بعد میں سوچنے لگا۔ اب کیا کرنا چاہیئے، دل سیماب
کی طرح مضطرب ہو رہا تھا۔ مَیں نے ہمت کر کے منورما کے کمرے کے دروازے
پر جا کر دیکھا، منورما کوئی ناول دیکھ رہی تھی، کمرے میں جانے کی ہمت نہ ہوئی، اُلٹے

پاؤں واپس چلا آیا۔ اور دل بہلانے کے لئے ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا، لیکن کتاب سے دل کیا بہلتا، اور اُلجھن سی معلوم ہونے لگی۔ کسی طرح نصف گھنٹہ گزار کر میں پھر منورما کے کمرے کے دروازے پر گیا، اس بار کمرے کی روشنی گُل تھی میں اپنے ہی گھر میں دبے پاؤں چور کی طرح آگے بڑھا، منورما سو رہی تھی۔ اور اُس کے سانس کی آواز برابر میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

میں چُپکے چُپکے جا کر اُس کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اُس وقت میرے دل کی عجیب حالت تھی، معلوم ہوتا تھا، پہلو سے تڑپ کر باہر نکل جائے گا۔ میں نے اس کے بدن پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا، اُس نے دُوسری طرف کروٹ بدل دی۔ میں نے آہستہ سے آواز دی "منورما!"

منورما کچھ نہ بولی۔ کچھ دیر تک تو میں خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن اس طرح کب تک ضبط سے کام لیتا؟ موہنی کے سینما سے واپس آنے کا وقت ہوتا جا رہا تھا اور صبح منورما کا چلا جانا یقینی تھا۔ میں نے دل کڑا کر کے پھر منورما کے بدن پر ہاتھ رکھا۔ اُس نے اب بھی کچھ نہ کہا اور نہ کسی طرح کا تعرض کیا، میں سوچنے لگا۔ اس آسانی سے رل جانے والی منورما کو اپنے سے کس قدر دُور سمجھتا تھا، میں کیسی غلط فہمی میں مبتلا تھا، میری رگ رگ میں بجلی سی دوڑ گئی۔ میں منورما کے سوا دُنیا کی ہر چیز سے بے خبر ہو گیا۔ اور شاید منورما سے بھی، بلکہ اپنے سے بھی! مجھ پر بالکل خود فراموشی سی طاری ہو گئی۔

میری یہ خود فراموشی اُس وقت دُور ہوئی، جب باہر سے موہنی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں اس اندھیرے کمرے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صُبح کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا اور میں نے گناہ کے بوجھ سے دبی ہوئی آنکھوں کو بزور اوپر اُٹھا کر دیکھا تو موہنی سامنے کھڑی مُسکرا رہی تھی۔ بولی "۔اُٹھو، دیکھو منورما دیوی جا رہی ہیں۔"

اتنے میں منورما بھی آ گئی اور اسی طرح دونوں ہاتھ جوڑ کر مُسکراتی ہوئی بولی "نمستے" جس طرح اُس نے پہلے دن آنے کے وقت خندہ پیشانی اور بشاش چہرے کے ساتھ نمستے کیا تھا۔ وہ صُبح کے کنول کے پھُول کی طرح شگفتہ نظر آ رہی تھی۔

میرے مُنہ سے کوئی لفظ نہ نکلا، میں اُس کے پیچھے پیچھے تانگے تک گیا، موہنی اسے اسٹیشن تک پہنچانے گئی، میں تانگے تک جا کر واپس چلا آیا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد موہنی اسٹیشن سے واپس آئی، وہ مجھے دیکھتے ہی قہقہہ مار کر ہنسی اور بولی "منورما دیوی کے چلے جانے کا تو آپ کو بہت صدمہ ہوا ہو گا؟"

میری جو حالت تھی۔ اسے تو کچھ میں ہی جانتا تھا، پھر بھی میں نے کہا "نہیں تو، مجھے صدمہ کیوں ہونے لگا؟"

وہ شوخی سے آنکھیں نچا کر بولی "جب چور سامان سمیت پکڑا جائے تو اس کا انکار کرنا فضول ہے، آپ مجھ سے ناحق بن رہے ہیں۔"

میں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا "مجھے تنگ نہ کرو، صاف صاف کہو، کیا کہہ رہی ہو؟"

موہنی ہنستے ہوئے بولی "کیا خوب، تنہائی کا لُطف اُٹھائیں آپ اور صاف صاف کہوں میں!"

میں خاموش تھا۔

موہنی پھر بولی: "میرے بھائی سنیما گئے تھے نا؟ لیکن سوئی تھے جو گم ہو گئے اور تلاش کرنے پر بھی مجھے نہ ملے۔"

میں نے کہا: "مجھ سے تو سنیما جانے کو کہہ گئے، کہیں اور چلے گئے ہوں تو اسے میں کیا جانوں؟"

موہنی نے کہا: "بس اب زیادہ باتیں نہ بناؤ، مجھے اس حیلے سے گھر سے بھگانے کی کیا ضرورت تھی۔ منورما کوئی غیر تو تھی نہیں، تمہارے دوست ہی کی بیوی تو تھی، مجھ سے اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دینے میں ہرج ہی کیا تھا؟"

"تم ناحق وہم میں مبتلا ہو موہنی۔"

موہنی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی: "وہم میں میں مبتلا نہیں۔ تم نے خود اپنے آپ کو وہم میں اور نہ جانے کاہے کاہے میں ڈال رکھا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے کچھ پریشان ہو کر اور کچھ جھینپ کر سوال کیا۔

"مجھے حیلے سے سنیما بھیج کر اور منورما ...... اپنی مہمان اور اپنے دوست کی بیوی کے ساتھ گھر میں تنہا رہ کر ...... کہہ سب کچھ کہہ ڈالوں؟ ....."

میں بول اٹھا: "تم یہ سب کیا بکے جا رہی ہو موہنی؟ تمہارا تو جیسے دماغ چل گیا ہے۔"

موہنی نے کہا: "پھر بن رہے آپ، جب منورما ہی کچھ معترض نہ ہوئی تو مجھ سے چھپانے کی ضرورت؟ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے، جب آپ دونوں ایک دوسرے سے راضی تھے۔ میں درمیان میں دخل دینے والی کون؟ پھر مجھے تو خوشی بھی ہے کہ ......"

اعترافِ گناہ کے سوا چارہ نہ تھا۔ مَیں نے کہا۔ "موہنی! اب مجھے زیادہ شرمندہ نہ کرو، مَیں نے تمہارے ساتھ خیانت اور بے وفائی کی ہے۔"

موہنی بولی۔ "آپ نے میرے ساتھ تو کچھ بھی نہیں کیا، اگر خیانت و بے وفائی کی بھی تو اپنے دوست اور اس کی بیوی کے ساتھ کی۔"

شرم و ندامت سے میرا سر جھک گیا۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، مَیں نے گلوگیر آواز سے کہا۔ "مَیں نے بڑا پاپ کیا موہنی!"

موہنی میرا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "تم ناحق ذرا سی بات کا اتنا اثر لیتے ہو، تم نے کوئی پاپ نہیں کیا۔"

مَیں نے کہا۔ "نہیں نہیں موہنی، مجھ سے بڑا پاپی کوئی نہیں ہو سکتا، مَیں نے اپنی بیوی کے ساتھ، دوست کے ساتھ اور اس کی بیوی کے ساتھ بددیانتی اور خیانت کی، مجھ سے بڑھ کر گنہگار اور کون ہو سکتا ہے؟"

موہنی بولی۔ "تم جسے منورما سمجھ رہے ہو، وہ منورما نہ تھی......"

"پھر وہ کون تھی؟" مَیں نے گھبرا کر پوچھا۔

"مَیں تھی۔"

"اور منورما؟"

"وہ سینما گئی تھی۔"

"تم مجھے بے وقوف کیوں بناتی ہو موہنی؟"

"تمہیں جو کچھ بنانا تھا وہ کل بنا چکی، آج مَیں تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہی سچ کہہ رہی ہوں۔"

"تو کیا وہ منورما نہ تھی؟"

"نہیں!"

"میں کیسے یقین کر لوں؟"

"یہ دیکھو اپنا رقعہ!"

موہنی نے میرا رقعہ جو میں نے منورما کے لئے لکھا تھا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔

موہنی کہنے لگی "اس کے علاوہ ہم دونوں نے پہلے ہی تمہارا رُخ سمجھ لیا تھا۔ اور جب مجھے تنہا سینما بھیجنے لگے۔ تو ہم دونوں نے سمجھ لیا کہ تمہارا ارادہ کیا ہے اسی لئے ہم نے مشورہ کر کے یہ ترکیب کی"

میں محجوب تھا اور مسرور بھی!

طالب علم کی ڈائری

۵ر فروری ۱۹۴۹ء

انسان فطرتاً ندرت پسند اور جدت پرست واقع ہوا ہے۔ نیت نئی چیزیں دیکھنے اور نئے لوگوں سے ملنے کا شوق ہمارے دلوں میں کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ جہاں تک میرے مشاہدے کا تعلق ہے، مَیں کہوں گا۔ ہر شخص تنوع کا شیدائی ہے۔ بسا اوقات عرصے تک اچھی چیزوں کے پاس اور ساتھ رہتے رہتے ہمارے دلوں میں تبدیلی چیزوں کی خواہش بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

کالج بند ہونے کے بعد چھٹیاں گزارنے کے لئے مَیں اپنے چچا کے ہاں شمالی

بہار کے ایک سنسان اور ویران مقام پہ آ گیا ہوں۔ یہاں کے رہنے والے یہاں کی بے کیفیوں اور ویرانیوں سے اُکتا گئے ہیں، لیکن مجھے یہ پُرسکون جگہ بہت پسند آ رہی ہے۔ مَیں یہاں سکونِ خاطر محسوس کر رہا ہوں۔

میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ یہ شارع عام سے کسی قدر فاصلے پہ ہے۔ اس کے گرد و پیش وسیع میدان ہے۔ میرے کمرے کے بائیں بازو پہ ایک شاندار مکان ہے۔ سُنتا ہوں، یہ بہت دنوں سے خالی پڑا ہے۔ داہنے بازو والے مکان میں ایک مہذّب کُنبہ رہتا ہے۔

مجھے اس سال بی۔اے کا امتحان دینا ہے۔ دوستوں نے کہا کہ پٹنہ ہی میں رہ کر امتحان کی تیاری کرو، لیکن مَیں نے سوچا، چچا کے ہاں نئی جگہ ہوگی۔ مَیں اجنبی ہوں گا ملنے جُلنے والے آکر پڑھائی میں مخل نہ ہوں گے۔ کچھ میری عادت سی ہو گئی ہے کہ جب امتحان قریب آتا ہے۔ تو پڑھنے کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں۔ اور چوبیس گھنٹے نہیں تو بارہ گھنٹے پڑھنا میرا معمول ہو جاتا ہے۔

میرا جو دوست مجھے جہاز گھاٹ پہ پہنچانے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا: "جوگیش، تم احمق ہو۔ میرا جی تو چاہتا ہے، تمہیں بے وقوف ہی کہہ دوں۔ تمہیں پٹنہ سے باہر جانے کا اتنا ہی شوق تھا۔ تو امتحان کے بعد جاتے۔ پٹنہ مرکز ہے۔ یہاں کتابیں ملیں گی۔ سوالات کا پتہ لگے گا اور کتنی ہی آسانیاں ہیں۔ دُور دراز مقامات سے طلبہ یہاں آ رہے ہیں اور تم ہو کہ کہیں اور جا رہے ہو!"

مَیں نے ہنس کر بات ٹال دی، کہا: "تم ہزار سبز باغ دکھاؤ میں رُک نہیں سکتا مجھے کوئی چیز وہاں کھینچے لئے جا رہی ہے!" اُس نے ہنس کر کہا: "تمہاری بد قسمتی

کھینچے لئے جا رہی ہے پاس تو ہو ہی جاؤ گے لیکن آنرز ملنے سے رہا۔" میں نے دل میں کہا "خیر یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

۷ر فروری ۱۹۴۹ء

میں نے یہاں آتے ہی چچا اور چچی کو بتا دیا ہے کہ میں یہاں تنہائی میں پڑھنے کے خیال سے آیا ہوں۔ ساتھ ہی کام کی اہمیت بھی بتا دی ہے یعنی بی۔ اے کا امتحان دینا کوئی معمولی کام نہیں۔ بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ دنیا بھر کی کتابیں ہیں اور ایک سے ایک موٹی۔ دو سال موج کی ہے اب ان تینوں مہینوں میں کس کی تلافی کرنی ہے۔

میرے چچا اپنے کالج کے کامیاب متعلّم تھے۔ اچھے نمبروں سے پاس ہونے کے باعث کسی سفارش کے بغیر انہیں اچھی پوسٹ مل گئی تھی۔ آج انہوں نے میری بات سُن کر کہا ——— "یہی تو بُری بات ہے تم لوگوں میں۔ اب تین مہینے رات رات بھر پڑھو گے۔ اس سے کہیں اچھا تھا اگر دو سال تھوڑا تھوڑا پڑھتے رہتے۔"

میں نے کہا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن جب تک امتحان نزدیک نہیں آتا۔ پڑھنے میں میری طبیعت نہیں لگتی۔"

۸ر فروری ۱۹۴۹ء

اب مجھے ایک علٰحدہ کمرہ مل گیا ہے اور بچّوں کو تاکید کر دی گئی ہے کہ بھیا کو تنگ نہ کریں۔ اسے بہت بڑا امتحان دینا ہے۔

میں نے اپنے کمرے کی الماری میں کتابیں رکھ دیں اور سامان ترتیب سے

رکھ کر سوچنے لگا۔ پڑھائی آج سے شروع کروں یا کل سے؟ یوں تو میں کسی چیز کا عادی نہیں لیکن جانے کیسے سگریٹ پینے لگ گیا ہوں۔ خاص کر جب کسی بات پہ غور کرنا ہوتا ہے تو کرسی یا ٹیبل پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش کھینچتا ہوا سوچتا ہوں۔ آج بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ دھوئیں کے بل کھاتے ہوئے مرغولے کمرے کی فضا میں چھانے لگے۔ میں نے ہوا کی کمی سے پریشان ہو کر کھڑکی کھول دی۔ بغل والے مکان کے کمرے کی کھڑکی بھی اسی طرف کھلتی تھی۔ ایک نوخیز لڑکی پہ نظر پڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ ابھی ابھی سج دھج کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہو۔ مجھے دیکھ کر کچھ جھجکی۔ لیکن ہٹی نہیں۔ اُس نے ایک نظر میری طرف دیکھا پھر نگاہ پھیر لی۔

"یہ کیا بلا ہے؟" میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ "کیا آفت ہے پھر تو پڑھائی ہو چکی"۔ میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا اور چارپائی پہ بیٹھ کر سگریٹ کے کش کھینچنے لگا۔ ایک لمحہ کے بعد میں نے دزدیدہ نگاہوں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی ابھی تک کھڑی تھی۔ میں اپنی کتابوں کی طرف دیکھنے لگا اور سوچنے لگا۔ پہلے تاریخ شروع کروں یا اکنامکس؟ ابھی یہ سوچ رہا تھا کہ بغل کی آواز سے چونک کر میں کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کسی کو ڈانٹ رہی تھی ——— "ارے دیبو! دیکھ تو اس طرح کودے گا تو تیری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی، بھاگ وہاں سے"۔

میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ اور بچوں کی حرکتیں دیکھنے لگا۔ ساتھ ہی نظر گھما کر اُس لڑکی کو ذرا غور سے دیکھا۔ اُنیس بیس کی عمر ہو گی۔ بشرے سے شوخی ٹپکتی تھی۔ رنگ معمولی تھا لیکن بالوں اور ابروؤں میں کچھ ایسا گھنا پن تھا۔ جو اُس کے چہرے کو

جاذبیت تو جیسے اوس حسین بنا رہا تھا۔ جسم سڈول اور اعضا متناسب تھے۔ آنکھیں پرکشش تھیں۔ اس کی مانگ کے سیندور کو دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں کہا، شادی ہو گئی ہے ابھی اتنی بیباک ہے۔

مرد اور عورت میں ایک دوسرے کے متعلق جو فطری اشتیاق اور کشش ہوتی ہے۔ شادی ہونے کے بعد ایک حد تک سرد پڑ جاتی ہے۔ اگر میری بھی شادی ہو گئی ہوتی تو اسے اس طرح یہاں کھڑی دیکھ کر میرے دل میں کوئی احساس پیدا نہ ہوتا۔ دل پر جبر کر کے میں نے پھر کتابوں کی طرف نظر پھیری لیکن نگاہ اور دل دونوں گریز کر رہے تھے۔ جی کچھ اور ہی سوچنے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بج رہا تھا۔ دل نے فریب دینا شروع کیا بھلے آدمی آج ذرا دم لو۔ پڑھنے کے لئے اتنے دن پڑے ہیں .... اور میں چادر تان کر لیٹ گیا۔

لیکن لیٹ کر فوراً سو نہیں گیا۔ جی چاہتا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں سوچوں۔ کالج کی باتیں سوچوں۔ لیکن ہر دو لمحہ کے بعد ذہن اس لڑکی کی طرف منتقل ہو جاتا۔ ——— وہ کون ہو گی؟ کیا نام ہو گا اس کا؟ کتنی کشش ہے اس میں اور نہ ہر جوان لڑکی میں کشش ہوتی ہے کشش جوانی ہی کا دوسرا نام ہے۔ پٹنہ میں ایک بدصورت جوان لڑکی کو دیکھ کر میں نے کہا تھا کہ اگر دو مہینے تک مسلسل اسے دیکھتا رہوں تو مجھے لڑکیوں سے نفرت ہو جائے گی اور کتنی لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس لڑکی سے محبت کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ توبہ توبہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک

بیاہی ہوئی عورت کے بارے میں ایسے خیالات ——— ؟ کبھی میری بھی شادی ہوگی اور میری بیوی کے سامنے اگر کوئی ایسے بد باتیں رکھے تو میں اُسے کتنا بُرا سمجھوں گا۔

یُوں ہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔ میں تھکا ہُوا تو تھا ہی۔ سویا تو چار بجے تک سوتا رہا۔ سو کر اُٹھنے کے بعد تکان بہت حد تک کم ہو چکی تھی۔ میں اپنے اندر ایک تازگی محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہا ذرا گھوم آؤں۔ میں گھر سے نکل پڑا۔ سامنے دُور دُور تک میدان پھیلے ہُوئے تھے۔ میں سوچنے لگا اتنی سنسان جگہ میں لوگوں کا دل کیسے لگتا ہوگا؟ یہاں نہ بازار ہیں نہ چہل پہل ہے نہ سڑکوں پر عورتوں اور بچوں کا ہجوم و خرام ——— پھر دل ہی دل میں کہنے لگا۔ جو لوگ شروع سے یہیں رہتے ہیں۔ اُنہیں کاموں سے فرصت ہی کہاں ملتی ہوگی۔ جو فضا اور ماحول کی بے کیفی سے متاثر ہوں۔ اپنی ہی بات لو، کورس ختم کرنا ہے اور صرف تین مہینے باقی ہیں۔ سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہیں۔ یا پھر اُس لڑکی کو دیکھ لو۔ خواہ جگہ کتنا ہی سنسان اور بے کیف ہو لیکن وہ اپنے شوہر کے ساتھ کتنی مسرور، کتنی خوش رہتی ہوگی...... میرے خیالات کی رَو گھومتی پھرتی پھر اُسی لڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا آخر اُس لڑکی میں کیا رکھا ہے۔ جو میں بار بار اُس کی بات سوچنے لگ جاتا ہوں ——— ؟ میں اچھا لڑکا سمجھا جاتا ہوں۔ مجھے ان لڑکیوں سے کیا۔ مجھے تو پڑھنا چاہیئے۔ کہاں امتحان کی تیاری کہاں یہ ذہنی عیاشی۔

میں سیر کر کے واپس آیا۔ تو نہ جانے کیوں میری طبیعت افسردہ تھی۔ میں نے

تہیہ کر لیا۔ کہ اس کھڑکی کو بند رکھوں گا اور کمرے میں آکر میں نے پہلا جو کام کیا وہ کھڑکی کو بند کرنا تھا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۹ء

میرے پڑوس میں ایک وکیل صاحب ہیں۔ ایک چھوٹے سے سب ڈویژن کے چوٹی کے وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اس لئے اس شہر میں ان کا کافی اثر و رسوخ ہے لیکن ان کی گھریلو زندگی پُر مسرت نہیں۔ ان کی دائم المرض بیوی جب تک جیتی رہی۔ یہ اس کی دوا دارو میں سرگرداں رہے اور جب اُس نے مر کر ان کی جان بخشی تو تین مریض اور شریر بچے تیمارداری و دلسوزی کے صلے یا سزا کے طور پر چھوڑ گئی۔

یہ سرسوتی وکیل صاحب کی چھوٹی بہن ہے۔ ابھی دو سال ہوئے اُنہوں نے اس کی شادی کی ہے۔ اس کا شوہر بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ شادی کو دو سال ہو گئے وہ ابھی تک بی۔ اے کر رہا ہے۔

سرسوتی ہی وکیل صاحب کی گرہستی سنبھالے ہوئے ہے۔ بہت ہی سلیقہ مند اور منتظم ہے۔ وکیل صاحب اس کے بڑے مداح ہیں۔ سُنتا ہوں اس میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں۔ کچھ بُرائیاں بھی ہیں۔ اور شاید ان بُرائیوں کو بھی وکیل صاحب خوبیاں ہی سمجھتے ہوں ——— سرسوتی شوخ و شنگ اور عشوہ طراز لڑکی ہے یہ کسی بات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادی نہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ انجام و مآل سے بے پرواہ ہو کر جو جی میں آتا ہے۔ کر گذرتی ہے تیتلی کی طرح پھدکتی پھرتی ہے۔ عشرت پرستی اور عیش پسندی اس

کی فطرت بن گئی ہے۔ پُرتکلّف وکشش انگیز ملبوس سے سج دھج کر نوجوانوں کے ساتھ سیر وتفریح کرنے کا شوقِ بیتاب اسے ہر وقت مضطرب رکھتا ہے۔ اس کی پُرشوق اور پیاسی آنکھیں صاف بتاتی ہیں کہ اس کی مچلتی ہوئی جوانی —— اُمنڈتا ہوا شباب —— اور دھڑکتا ہوا دل کسی جوان دل کی دھڑکنیں سُننے کے لیے ہر لمحہ بیتاب و بے قرار ہے۔

جب سے مَیں آیا ہوں۔ وہ میرے چچا کے ہاں کثرت سے آنے لگی ہے۔ آج بھی وہ بار آ چکی ہے۔ میری چچازاد بہنیں اندو اور موہنی اس کی سہیلیاں ہیں۔ وہ اُن سے میرے متعلق بہت کچھ جان گئی ہے۔ اندو اس سے میری تعریف کرتی ہے۔ کہتی ہے "جوگیش بھیّا بڑے نیک اور نرم دل ہیں۔ غصّہ کرنا تو جیسے انہیں آتا ہی نہیں۔ اُن کے پاس کوئی فکر پھٹکتی ہے نہ رنج۔ ہر وقت خوش رہتے ہیں۔ پڑھنے میں ہمیشہ اُونچے نمبر پاتے ہیں۔"

مَیں آج اپنے کمرے میں سے سُن رہا تھا۔ موہنی کہہ رہی تھی "اری سرسوتی! تجھے جوگیش بھیّا کی ایک عجیب بات بتاؤں؟ تجھے بھی ہنسی آئے گی۔ یُوں تو عورتیں مردوں سے پردہ کرتی ہیں۔ اور یہ خود عورتوں سے شرماتے ہیں۔ آج تک کبھی انہیں کسی عورت سے بات کرتے نہیں سُنا۔ نہ کسی عورت کو گھورتے دیکھا۔ عورتوں کے سامنے اُن کی آنکھیں اپنے آپ جُھک جاتی ہیں۔ سینما سے تو انہیں چِڑ ہے ...."

موہنی کی باتیں سُن کر سرسوتی ہنس پڑی۔ جیسے وہ کسی معصوم بچّے کی باتیں سُن رہی ہو۔

یکم مارچ ۱۹۴۹ء

بھیکو میرے چچا کے ہاں بہت دنوں سے ملازم ہے۔ بات بات پر جھوٹ بولتا ہے زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ پھر بھی جی بہلانے کے خیال سے فرصت کے وقت اس سے مزے لے لے کر باتیں کرتا ہوں۔ آج میں نے اس سے کہا "یہ بہت منحوس جگہ ہے بھیکو۔ کیوں؟"

"ہاں سرکار جی نہ لگتا ہوگا" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں جی تو میرا ان کتابوں سے لگا رہتا ہے۔ جانتے ہو امتحان میں دو ہی مہینے باقی ہیں"

"پڑھائی بھاری ہے سرکار۔ خوب محنت کیجئے۔ پھر بڑے سرکار بن جائیے گا تو ہمیں رکھیئے گا"

بھیکو کی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ افسر بننا اتنا آسان ہے۔ پھر کچھ ٹھہر کر بولا "چچا نے مکان ایسی جگہ لیا ہے کہ ہر طرف سناٹا۔ ہر طرف اداسی۔ لے دے کے بغل میں یہ وکیل صاحب ہیں لیکن ان کی وکالت چلتی خوب ہے بھیکو"

"بدقسمت آدمی ہے بابو۔ وکالت چلنے سے کیا ہوتا ہے"

"کیوں ——؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"گھر میں کوئی نہیں۔ عورت مر گئی۔ لڑکے تباہ ہو گئے۔ ایک بہن ہے اس کے لچھن بھی اچھے نہیں"

"کیوں اسے کیا ہوا ——؟" میں نے تعجب اور اشتیاق سے پوچھا۔

"کس کام کی عورت ہے بابو۔ جدھر نکلتی ہے۔ لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں"

"آخر بات کیا ہے؟"

"بہت خراب عورت ہے۔" بھیکو نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"سنوں بھی آخر اس میں کیا خرابی ہے۔ کچھ کہو گے بھی؟"

"یہی چال چلن ٹھیک نہیں، آپ سمجھا دیں۔ نوکر کہیں کبھی کوئی، کبھی کوئی کرتی دکھتا کہوں سرکار۔"

"چھوٹا کہیں کا۔ کس نے کہا تم سے؟" وکیل صاحب سُن لیں گے تو جان سے مار ڈالیں گے۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"اب آپ کو یقین نہ ہو تو میں کیا کروں سرکار! ابھی دو مہینے بھی نہیں بیتے کہ دیبو سب سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ ماسٹر جی بابو کے ساتھ......"

"ہوں، بچے میں کسی نے سکھا دیا ہوگا۔ اچھا ماسٹر جی کون ہے؟"

"دیبو کا ماسٹر سرکار۔"

"پاگل کہیں کا۔ اس کالے کلوٹے سوکھے ہوئے آدمی میں کیا رکھا ہے جو کوئی عورت اس کی طرف دیکھے گی۔"

"عورت کے دل کا حال جاننا بہت مشکل ہے بابو۔ تریا کے من کا بھید کون جانے۔ اس کالے کلوٹے ہی کی کسی ادا پہ ریجھ گئی ہوگی۔"

"کیا گندی باتیں کرتا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

آج رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ سرسوتی کی صورت میری آنکھوں کے سامنے گھومتی رہی۔ میں سوچنے لگا۔ وہ بدچلن عورت ہے۔ اس سے نفرت کرنی چاہیئے لیکن ایسی کوئی عورت کبھی مجھے نہیں ملی۔ یہ میری بدقسمتی ہی ہے پھر خیال

آیا۔ بدقسمتی کیوں خوش قسمتی ہے کہ پرماتما نے مجھے بُرے راستے سے دُور رکھا ہے تو یہ تو یہ، بڑے گھروں میں بھی ایسی رنگ رلیاں ہوتی ہیں۔ سرسوتی کی صورت تو اتنی بھولی ہے اور علچن ایسے ———— ؟

۴ مارچ ۱۹۴۹ء

آج پڑھنے بیٹھا تو میں نے کھڑکی کھول دی اور کرسی قریب کھسکا کر سوچنے لگا۔ میں بھی کیسا منحوس ہوں۔ کھڑکی بند کر کے بیٹھا رہتا ہوں۔ کھڑکی کھولنے سے فرحت بخش ہوا آتی ہے طبیعت بشاش رہتی ہے۔

سامنے کھڑکی کی طرف میری نظر کئی بار گئی۔ لیکن وہاں کوئی نظر نہ آیا ——
یکایک دیپو کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا۔ جیسے میں چڑیا گھر کا کوئی جانور ہوں۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا، لیکن کچھ بولا نہیں۔ کھڑا کھڑا کچھ دیر کے بعد دیپو ہی بولا ———— "ذرا اپنی کتاب دیجئے تو۔"

"کیوں ————؟" میں نے تعجب سے پُوچھا۔

"اس میں سے تصویر پھاڑ دوں گا۔"

اُس کی بات سُن کر مجھے ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی آیا کہ یہ لڑکا کتنا ٹیڑھا مطالبہ پیش کر رہا ہے۔ اور کتنی بے تکلفی سے۔ میں نے کہا۔ "نہیں تصویر پھاڑنے سے کتاب خراب ہو جائے گی اور پھر میری کتاب میں تصویر ہے بھی نہیں۔"

"اتنی موٹی کتاب میں تصویر ضرور ہو گی۔" شریر لڑکے نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی تصویر نہیں، میری کتاب ہے، میں جانتا ہوں۔"

"تو دکھاتے کیوں نہیں ؟"

یکایک سامنے نظر گئی تو دیکھا سرسوتی اپنی کھڑکی میں کھڑی ہے میں کچھ سوچ کر اُٹھا، اور دیبو کے ہاتھ میں کتاب دے کر کہا ——— "لو دیکھ لو۔"

اُس نے کتاب اُلٹ پلٹ کر دیکھی اور بولا "اس کی قیمت کتنی ہے ؟"

"بارہ روپے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہو، بارہ روپے کی کتاب اور تصویر ایک بھی نہیں ؟ کتاب والے نے آپ کو دھوکا دے دیا۔"

"کیا کروں بے وقوف جو ہوں" ۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو میں اس کے ورق کی ناؤ بناؤں گا۔" کہتا ہوا دیبو کتاب لے کر بھاگنے لگا۔ کھڑکی میں کھڑی ہوئی سرسوتی اس کی حرکتیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے اُسے ڈانٹا" دیبو، کیوں تنگ کرتا ہے، انہیں پڑھنا ہے۔" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ دیبو کو ڈانٹ کر خود مسکرا پڑی۔ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر دیبو کی ہمّت بڑھ گئی۔ وہ کتاب ہاتھ میں لے کر اُچھل اُچھل کر گانے لگا۔

پڑھو گے لکھو گے ہو گے خراب
کھیلو گے کودو گے ہو گے نواب

مجھے غصّہ آ رہا تھا۔ میں نے کہا "اچھا کتاب دے کر گایئے گا۔" لیکن شریر دیبو شور کرتا ہی رہا۔

میری بات پر سرسوتی کو ہنسی آ گئی لیکن وہ خود کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی ——— "دیبو کتاب دے دے۔ نہیں مانتا ادھر آتا ہے

یا نہیں ؟"

دیپو سہم کر سرسوتی کے پاس چلا گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے اُس کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے کتاب چھین کر کہا "جا بھاگ یہاں سے"۔ دیپو کتاب چھوڑ کر بھاگا۔

سرسوتی نے میری طرف کتاب بڑھا کر کہا "لیجئے اپنی کتاب"۔

میں کھڑکی کے پاس گیا اور کتاب لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ سرسوتی کتاب دیتے ہوئے بولی۔ "آپ کو اتنا پڑھنا ہے اور بچے تنگ کرتے ہیں"۔

"نہیں تنگ کیا کرتے ہیں۔ بچے جو ہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں میں انہیں ڈانٹ دوں گی۔ سنا ہے آپ کو بہت پڑھنا ہے" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں پڑھنا تو ہے" کہتا ہوا میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سرسوتی بھی کھڑکی سے ہٹ گئی۔

میں اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگا۔ وہ پڑھنے کی بات کہہ کر اس طرح مسکراتی ہے جیسے میں پڑھتا کیا ہوں۔ بہت بڑی حماقت کرتا ہوں آخر پڑھنے میں برائی کیا ہے آج محنت کر دوں گا تو کبھی ثمرہ ملے گا ہی میں ضرور پڑھوں گا۔

——— لیکن سرسوتی کی مسکراہٹ مجھے بار بار یاد آ رہی تھی۔ سوچنے لگا آخر وہ مجھے دیکھ کر یوں مسکراتی کیوں ہے؟ میں نے آئینہ اُٹھا کر اپنا مُنہ دیکھا صورت بھی بری نہ تھی۔ کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ بال بھی ٹھیک تھے۔ میں نے کہا اونہہ میں بھی عجیب احمق ہوں فضول اور لایعنی باتوں کے لئے دماغ خراب کرتا ہوں۔

میں پھر کتاب لے کر پڑھنے لگا۔

۱۰ مارچ ۱۹۴۹ء

اب میری کھڑکی ہر وقت کھلی رہتی ہے کبھی کبھی سرسوتی نظر آجاتی ہے ظالم میری طرف دیکھتے ہی مسکرا دیتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ کا جو بھی مطلب ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ستانے کے لئے مجھے دیکھ کر مسکراتی ہے۔ پھر بھی جی چاہتا ہے، ہر وقت اُسے مسکراتی ہوئی دیکھتا رہوں اور اس کی شرارت کا نشانہ بنتا رہوں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ میں کتاب پر نظریں گاڑے ہوئے پڑھتا رہتا ہوں اور محسوس ایسا ہوتا ہے کہ وہ کھڑکی میں کھڑی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آج کئی بار ایسا ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہے تو میں اپنے دل میں ایک شوق انگیز گدگدی سی محسوس کرتا ہوں۔

ادھر کئی دنوں سے میں نے شام کی سیر چھوڑ دی ہے۔ کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اُس کی مسکراہٹ کا انتظار کرنے میں سیر سے کہیں زیادہ کیف وسرور محسوس کرتا ہوں۔ گھر والے سمجھتے ہیں، جوں جوں امتحان قریب آتا جاتا ہے میں پڑھنے میں زیادہ منہمک ہوتا جا رہا ہوں۔

۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء

آج کئی دنوں کے بعد کپڑے پہن کر گھر سے نکلا ہی تھا کہ سامنے کھڑکی پر نظر پڑ گئی۔ سرسوتی روز کی طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی ——— "پڑھائی ختم ہوگئی کیا؟"

"ہاں ٹہلنے جا رہا ہوں۔"

"کیوں ———؟"

"پڑھنے میں جی نہیں لگتا۔"

"واہ سنیاسی جی کا بھی دھیان ٹوٹا۔" سرسوتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مَیں ہنس کر آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا۔ مَیں سنیاسی ہوں۔ سرسوتی مجھے سنیاسی سمجھتی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میرے دل میں کیسا طوفان اُٹھ رہا ہے ——— مَیں اس گھر سے جس میں وہ رہتی ہے دُور ——— بہت دُور چلا جانا چاہتا ہوں۔

۲۲ر اپریل ۱۹۴۹ء

آج میں کھڑکی کے پاس بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ سامنے سرسوتی آتی ہوئی نظر آئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ نئے نئے رنگین کپڑوں میں ملبوس دوشیزہ گلاب کی کلی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے میرے قریب آکر کہا ——— "آج ہولی کے دن آپ مہرمی کیوں بن رہے ہیں؟"

"کیا مطلب ———؟" مَیں نے اُس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"آج تو پڑھائی بند کیجئے ہولی منائیے۔" سرسوتی نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ہولی؟"

"ہاں، آج ہولی ہے۔"

"ہاں ہے تو۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"تو ہولی کھیلئے۔"

"ہولی کھیلوں......؟"

ایک جوان عورت جس سے کوئی رشتہ نہ تعلق اُسے اپنے اتنے قریب آکر بے تکلفی سے باتیں کرتے ہُوئے دیکھ کر مَیں گھبرا گیا۔

"اور کیا!"

"مجھے کھیلنا نہیں آتا۔" مَیں نے سنجیدگی سے کہا۔

سرسوتی نے مٹھی میں عبیر بھرا اور میرے مُنہ پر مَل دیا۔ میرا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ لیکن یہ سُرخی صرف عبیر کی نہیں تھی۔ اُس میں شرم و حیا کی جھلک بھی شامل تھی۔

سرسوتی بولی "یوں ہولی کھیلا کرتے ہیں۔"

"میرے پاس عبیر نہیں۔" میرے مُنہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔

"یہ لیجئے۔" سرسوتی نے میری مُٹھی عبیر سے بھر دی۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے مُسکراتے ہُوئے اپنا حسین چہرہ میرے ہاتھ کے قریب کر دیا۔ پہلے تو مَیں جھجکا۔ پھر کانپتے ہوئے ہاتھ سے اُس کے مُنہ پر عبیر مَل ہی دیا۔ دو جوان جسموں کے لمس سے میرے بدن میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی۔ مَیں وفورِ جذبات اور شدتِ احساس سے سہم گیا۔ سرسوتی دِلربا انداز سے بل کھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء

آج اتوار ہے۔ ہولی گزرے ہُوئے تقریباً ایک ہفتہ ہو گیا۔ اِن دنوں میں مَیں ایک سطر نہ پڑھ سکا۔ پڑھنے میں جی ہی نہیں لگتا۔ دِل میں سرسوتی بسی ہُوئی ہے۔ آنکھوں میں سرسوتی سمائی ہوئی ہے۔ وہ سامنے آتی ہے تو اسے پیاسی نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ اُس کی مست و مخمور آنکھوں سے جوانی کی شراب پیتا ہوں۔ وہ

میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی ہے۔ مآل و انجام سے بے خبر چلا جا رہا ہوں۔ بہا جا رہا ہوں۔ دل پہ تیر کے کتابیں کھولتا بھی ہوں۔ تو سیاہ سطریں سرسوتی کی رنگین تصویر معلوم ہوتی ہیں۔ میں اس کے خیال میں کھو جاتا ہوں۔ گم ہو جاتا ہوں۔

۱۳ مئی ۱۹۴۶ء

آج طبیعت بہت بے کیف تھی۔ ایک افسردگی تھی جو ذہن و دماغ پہ چھائی ہوئی تھی۔ دل میں بیٹھا بیٹھا رہ رہا تھا۔ کھڑکی پر سیکڑوں بار نگاہیں جا جا کر تھک گئیں لیکن سرسوتی نظر نہ آئی۔ ندی کے پاس وہ کہیں دور رہتی ہے۔ دور رہنے پہ یک گونہ سکون ملتا ہے۔ میں یکایک دھوپ ہی میں گھر سے نکل پڑا اور سوچا کہیں دور چل کر جی بہلاؤں۔ سرسوتی مجھے لگاوٹ کی نظر سے دیکھتی ہے لیکن ہے تو ظالم عورت! اُسے میرے دردِ دل کی کیا خبر۔ کیا پروا۔ وہ کیا جانے کسی پہ کیا گزر رہی ہے۔

میں سارا دن دھوپ میں پھرتا رہا۔ دور دور کی خاک چھانتا رہا۔ پورب سے کالے پہاڑ کی طرح گھنگھور گھٹا اُٹھنے لگی میرے پاس چھتری نہ تھی۔ اس لئے لمبے لمبے قدم بڑھاتا گھر کی طرف چلا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک عورت نظر آئی۔ رفتار سے سرسوتی معلوم ہو رہی تھی۔ ساون کی سرمست ندی کی طرح اٹھلاتی بل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں قریب پہنچا تو دیکھا واقعی وہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کہاں سے آ رہی ہیں آپ؟"

وہ چونک پڑی پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر بولی "اوہ! آپ!

کہاں سے آ رہی ہیں؟"

"یوں ہی ذرا ٹہلنے نکل گئی تھی۔"

"اوہ، معلوم ہوتا ہے، آج پانی برسے گا۔" میں نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کہا۔

"ہاں گھٹا تو یہی کہہ رہی ہے۔ آپ کی پڑھائی کا کیا حال ہے جوگیش بابو؟"

"پڑھ رہا ہوں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

سرسوتی سے اتنا کھُل کر باتیں کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ پھر بھی ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے ہم ایک دوسرے سے مدت کے شناسا ہوں۔ ایسا ہوتا ہی ہے۔ زیادہ دنوں تک قریب رہنے سے بات شروع ہوتے ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد ہماری جھجک بھی دور ہو گئی۔

یکایک بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔ اور دیکھتے دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گھر قریب آگیا تھا۔ لیکن ہم پہنچ نہ سکے اور دونوں بغل والے خالی مکان کے برآمدے میں چلے گئے۔ گھنگھور گھٹا گھری ہوئی تھی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سورج رہتے ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ سنسان مکان ——— تنہائی ——— گھنگھور گھٹا ——— ٹھنڈی ہوا ——— ایک جوان عورت ——— ایک جوان مرد ——— میرے دل میں شدتِ احساس سے ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ ایک ہیجان برپا تھا۔ وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر میں نے سرسوتی کی طرف پیاسی نظروں سے دیکھا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا ——— "ادھر کونے میں چلی آؤ سرسوتی۔ وہاں بوچھاڑ آ رہی ہے۔ کپڑے بھیگ جائیں گے۔" وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ میرے پاس چلی آئی۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے

قریب کھینچ لیا۔ اُس نے کوئی تعرّض نہ کیا۔ مَیں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ اب مجھ میں یارائے ضبط کہاں تھا۔ حُسن مچلے اور جوانی بیتاب نہ ہو۔ بے قابو نہ ہو؟ ایسا کہیں ہوُا ہے؟ مَیں نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر کر پوُری قوّت سے بھینچ لیا۔ سرسوتی کچھ نہ بولی۔ جیسے اُس پر ایک نشہ، ایک خمار سا چھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے عجیب چمک نکل رہی تھی۔ اُس کے جوان جسم میں ایک حسین ارتعاش تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے، چھاتی دھڑک رہی تھی۔ اُس پر ایک از خود رفتگی سی طاری تھی۔

دفعتاً جیسے سرسوتی پر ایک بجلی سی گری۔ وہ تڑپ اُٹھی اور پوُری قوّت سے خود کو میرے بازوؤں کی گرفت سے چھُڑا لیا۔ اور چمک کر بولی ——

"آپ یہ کیا کر رہے ہیں جوگیش بابوُ ——؟"

میری حالت پاگلوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے پکڑنا چاہا، لیکن وہ الگ ہٹ گئی اور بولی —— "جوگیش بابوُ ہوش میں آؤ۔ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔"

لیکن مَیں از خود رفتگی میں جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہا تھا۔ مَیں نے اُسے پھر پکڑنا چاہا۔ اُس نے ایک تھپّڑ میرے مُنہ پر لگایا۔ مَیں جیسے آسمان سے زمین پر گر گیا۔ میرے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور مَیں سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

باہر ابھی تک پانی برس رہا تھا ——

مَیں نے اشک آلود آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا اور کہا "تم نے میری محبّت کا جواب بہت پیار سے دیا۔" میری یہ حالت دیکھ کر سرسوتی کی

آنکھوں سے بھی آنسو چھلکا ہی چاہتے تھے۔ اُس نے ضبط کی کوشش کرتے ہُوئے کہا ——— "جوگیش بابو آپ نے حرکت ہی ایسی کی ......"

مَیں نے آنکھیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا ——— "کیا مَیں اس کالے کلوٹے بیمار ہریش سے بھی بُرا ہُوں ———؟" سرسوتی چونک پڑی۔ مَیں نے کہا ——— "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ مَیں اتنا ذلیل اور کمینہ نہیں ہُوں۔ تُم بھلے گھر کی بہو بیٹی ہو۔ میری ایسی جرأت نہ ہوتی، مَیں تمہیں نہ چھُوتا" میرا ضمیر مجھے روکتا۔ لیکن مَیں تمہاری شوق نوازیوں کی کہانیاں سُن چُکا تھا۔ اس لئے مجھے آنکھوں کی حد سے گزر کر ہاتھوں سے اظہارِ تمنّا کرنے کی جرأت ہُوئی۔

"مَیں اس کے لئے .... شرمندہ ہُوں ......" محجُوب عورت اپنی ساڑی کے کونے کو اُنگلی میں لپیٹتی ہُوئی بولی۔

"مَیں جھُوٹ تو نہیں کہتا سرسوتی؟"

"نہیں ......" اُس نے دبی زبان سے کہا۔

"تو، پھر تُم نے میرے ساتھ ایسا سلُوک کیوں کیا ———؟ حُسن و جوانی کو اس طرح لُٹانے والی عورت کو کسی بھلے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟"

"تو، تُم مجھے عصمت فروش کہنا چاہتے ہو؟ مَیں عصمت فروش نہیں ہُوں۔ دکان نہیں کھول رکھی ہے۔" اُس نے کسی قدر طیش میں آکر کہا۔

"لیکن تمہارے چلن تو ایسے ہی ہیں۔"

"ایسا نہ کہو عصمت فروش عورتیں تو ایک بار گر کر پھر نہیں اُٹھ سکتیں ۔ میں پھر گرتی لیکن تم نے مجھے سنبھالا ۔ میں تمہیں اتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں تمہارے کردار کی بلندی سے میں بے حد متاثر تھی ۔ میں نے دیکھا کہ ایک دیوتا میری وجہ سے پاپ کی کھائی میں گر رہا ہے تو میں کانپ اُٹھی ۔ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہ لے سکی ۔ میں نے خود کو روکا ......"

میری آنکھیں چمک اُٹھیں ۔ میں متشکر نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا ہوا بولا ـــــ "سرسوتی تم سمجھتی ہو تمہیں گرنے سے میں نے سنبھالا ۔ اور میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے بچایا"

اُس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ـــــ "جوگیش بابو! میں تمہیں دیوتا سمجھتی تھی ۔ دیوتا کے دامن کو کیسے آلودہ ہونے دیتی"

جواب میں میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن مُنہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا ۔ پانی رُک چکا تھا ۔ لیکن میرے دل میں جذبات و احساسات کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا ۔ گھنگھور گھٹا ـــــ سہانی رُت ـــــ سرد ہوائیں ـــــ جوان عورت ـــــ سُنسان جگہ ـــــ

سرسوتی برآمدے سے نکل کر آہستہ آہستہ چلی گئی ۔ میں چاہتے ہوئے بھی میں اُسے روک نہ سکا ـــــ

ـــــ

پریم شاستر کام شاستر گرہیہ شاستر

مختصر سے عرصہ میں ان کتابوں کی چار لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس سے آپ ان کتب کی خوبیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی۔ یہ کتابیں عام بازاری کتابوں کی طرح دل خوش کرنے اور اخلاق خراب کرنے کیلئے نہیں لکھی گئیں۔ بلکہ ان کتب میں طب اور سائنس کی رو سے جنسی تعلقات پر پوری پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور تمام وہ باتیں تفصیل کے ساتھ لکھ دی گئی ہیں جن کا جاننا نوجوان جوڑوں کیلئے بہت ضروری ہے۔ شادی سے کچھ عرصہ پہلے اور شادی کے بعد آپ یہ تینوں کتابیں پڑھیں۔ ان کتابوں میں ایسے ایسے خفیہ راز درج ہیں۔ جو اکثر تجربہ کار سے تجربہ کار خاوند کو بھی معلوم نہیں۔ اور جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی کی حقیقی مسرتیں اور لذتیں حاصل ہونگی مرد و عورت کے تعلقات پر ان سے بہتر کتابیں دنیا کی کسی زبان میں آج تک شائع نہیں ہوئیں

پریم شاستر۔	باتصویر مجلد اردو ایڈیشن	تین روپیہ	ہندی ایڈیشن	تین روپیہ
کام شاستر۔	" " "	تین روپیہ	ہندی ایڈیشن	تین روپیہ
گرہیہ شاستر۔	" " "	تین روپیہ	" "	تین روپیہ

تینوں کتابیں اکٹھی منگوانے پر محصول ڈاک صرف آٹھ آنے

چارج کیا جاتا ہے

رسالہ بیسویں صدی دہلی

آرڈر دیتے وقت اپنا پتہ خوشخط لکھیں

وہ کتابیں
جو آپ کو ضرور پڑھنی چاہئیں!
میرے سپنے (افسانے) پروفیسر مس کرشنا کماری ایم۔اے تین روپیہ
فلمی پریاں (با تصویر) حسین و جمیل فلم ایکٹرسوں کے سچے حالات تین روپیہ
دل کے پیام (دلآویز افسانے) جناب آسی رام نگری دو روپیہ
حسن پرست اور دوسرے افسانے جناب یزدانی جالندھری دو روپیہ
محبت کی راہیں (افسانے) جناب محمد امین شرقپوری دو روپیہ
ایک حمام میں تین ننگے (افسانے) جناب سعید امرت دو روپیہ
دکھتی رگیں (افسانے) جناب شمس مظفرپوری دو روپیہ
ہنی مون اور دوسرے افسانے جناب کوثر چاندپوری دو روپیہ
شاہی محلات کی پریم کہانیاں (سچے افسانے) جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" دو روپیہ
صحت اور زندگی جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" تین روپیہ
ڈائری (چودہ دلکش رومانی ڈائریوں کا مجموعہ) جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" تین روپیہ
بڑے آدمیوں کا عشق (افسانے) جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" دو روپیہ
رسالہ "بیسویں صدی" دہلی
(نعمانی پریس دہلی میں چھپی)

خاوند اور بیوی کیلئے اِن کُتب کا مطالعہ
اِتنا ہی ضرُوری ہے جتنی کہ ایک
اِنسان کیلئے ہوا اور غذا ضرُوری ہے
پریم شاستر
کام شاستر
گربھ شاستر
गर्भ शास्त्र
काम शास्त्र
प्रेम शास्त्र
پوشیدہ راز ــــ خُفیہ باتیں ــــ کارآمد نکتے
اردو تین روپیہ
پریم شاستر
ہندی تین روپیہ
اردو تین روپیہ
کام شاستر
ہندی تین روپیہ
اردو تین روپیہ
گربھ شاستر
ہندی تین روپیہ
اِن کتابوں میں طِب
اور سائنس کی رُو سے ایسے ایسے
خُفیہ راز درج ہیں جو اکثر تجربہ کار
سے تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور
جنہیں جاننے کے بعد آپ کو شادی اور جوانی کی
اصلی مُسرتیں اور حقیقی لذتیں حاصل ہوں گی۔
اِن کُتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان
جیسے غریب مُلک میں اِن کُتب کی چار لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوُبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی!
تینوں کتابیں اکٹھی منگوانے پر محصُولڈاک صرف آٹھ آنے چارج کیا جاتا ہے!
مِلنے کا پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دھلی